Regd. No. 7243

Phone 880800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اکتوبر 1985

اس پرچہ میں

۱ ۔ تحریک اسلامی اور جمہوریت

۲ ۔ عورت کی حفاظت

شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام - ۲۵ بی - گلبرگ - لاہور

قیمت فی پرچہ 4 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ ——— لاہور

بدل اشتراک	ٹیلیفون :- ۸۸۰۸۰۰	قیمت فی پرچہ
سالانہ پاکستان / ۴۸ روپے غیر ممالک / ۹۸ روپے	خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور	۴ چار روپے
جلد ۳۸	اکتوبر ۱۹۸۵ء	شمارہ ۱۰-۵

فہرست

۱۔ لمعات ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۲
۲۔ حقائق و عبر : (۱) جماعتِ اسلامی کی انتخابی پالیسی (۲) تحریفِ حدیث (۳) تحریکِ اسلامی کا پیغام۔ ۷
۳۔ تحریکِ اسلامی اور جمہوریت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۹
۴۔ افکارِ پرویز کی صدی ۔ (محمد اسلام صاحب) ۔ ۔ ۔ ۔ ۳۲
۵۔ عورت کی حفاظت ۔ (ثریا عندلیب صاحبہ) ۔ ۔ ۔ ۔ ۴۹
۶۔ سپین میں مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۵۴
۷۔ قرآنی اسلام کیا ہے ؟ (مقصود حسین کیانی صاحب (لندن بزم)) ۔ ۔ ۔ ۔ ۵۷
۸۔ زرعی اراضی کی حدِ ملکیت کے بارے میں نئی بحث ۔ ۔ ۔ ۔ ۶۱

ایڈیٹر محمد خلیل۔ ناشر شیخ عبدالحمید، مقام اشاعت : ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور، مطبوعہ۔ اشرف پرنٹنگ پریس ۹۔ ایبک روڈ لاہور

لمعات

چند دن پہلے یعنی ۴ ستمبر ۱۹۸۵ء کو سری لنکا سے ایک اہم خبر آئی تھی۔ جسے اس دورِ جدید میں نوعِ انسانی کی بھلائی کا ایک اہم منصوبہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ خبر یہ تھی کہ وہاں انسانی جسم کے اعضاء کو محفوظ کرنے کے لئے ایک ٹشو بینک (TISSUE BANK) کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ سری لنکا کے اکثر باشندے، اپنی وفات سے پہلے یہ وصیت کر جاتے ہیں کہ ان کی موت کے بعد ان کے اعضاء ان کے جسم سے نکال کر ضرورتمند انسانوں کے جسموں میں پیوند کر دیئے جائیں۔ چونکہ وصیّت کردہ یہ اعضاء سری لنکا کی ضرورت سے زیادہ ہیں، اس لئے انہیں محفوظ کرنے کے لئے بینک کا قیام عمل میں لایا گیا ہے تاکہ دنیا میں جہاں کہیں بیمار انسانوں کو ان کی ضرورت پڑے، ان کی مدد کی جا سکے۔ اس منصوبے سے ہزاروں لاکھوں انسانوں کو دوبارہ زندگی مل سکے گی۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ ہمارے اخبارات جو جرائم کی خبروں سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں، نے اس اہم خبر کو اپنے کالموں میں جگہ دینی مناسب نہ سمجھی۔

ایک اخبار نویس سے جب اس سلسلے میں بات ہوئی تو اس نے یہ وضاحت کی کہ چونکہ ہمارے علماء ایسے منصوبوں کو خلافِ اسلام سمجھتے ہیں، اس لئے اس خبر کو کوئی اہمیّت نہ دی گئی۔ لیکن اگر قرآنی تعلیمات پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا، کہ اسلام اس عمل کو صرف پسندیدہ ہی قرار نہیں دیتا بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کے لئے تو یہاں تک فرما دیا:۔

وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا ط (المائدہ - ۳۲)

ترجمہ:۔ جس نے ایک انسانی جان کو زندہ رکھا، پس (یہ ایسا ہے) کہ اس نے ساری انسانیّت کو زندہ رکھا۔

اس دورِ جدید میں میڈیکل سائنس کی ترقی کی وجہ سے جب آنکھوں کی پیوند کاری کا عمل ممکن ہوا تو سری لنکا کے باشندوں نے وصیّتیں کرنی شروع کیں کہ ان کی موت کے بعد، ان کی آنکھوں کی دنیا کے اندھے اور دوسرے ضرورتمند انسانوں میں پیوند کاری کر دی جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے وہاں پر آنکھوں کا بینک قائم کیا گیا، جہاں ان وصیّت کرنے والوں کی آنکھوں کو ان کی موت کے بعد محفوظ کر لیا جاتا۔ اور دنیا میں جہاں کہیں اندھوں اور بیمار

آنکھوں والے انسانوں کو ان کی ضرورت ہوتی، وہاں انہیں استعمال کے لئے مہیّا کر دیا جاتا۔ آنکھوں کے بینک کا یہ تجربہ نہایت ہی کامیاب رہا۔ اور سری لنکا کی حکومت نے ساری دنیا کے ضرورتمند انسانوں کی بینائی بحال کرنے کے لئے مختلف ممالک کو ان آنکھوں کے تحفے بھیجے۔ جس کے نتیجے میں ہزاروں انسانوں کو بینائی کی نعمت عطا ہو گئی۔ ہمارے ملک میں بھی بے شمار نابینا افراد سری لنکا کے آنکھوں کے تحفے سے فائدہ اٹھا کر بینائی کی نعمت حاصل کر چکے ہیں۔ اس منصوبے کے بڑے دور رس نتیجے نکلے۔ اور سری لنکا کی اس کوشش کو ساری دنیا میں سراہا گیا۔

اس منصوبے کی کامیابی سے، اس میدان میں کام کرنے والے ڈاکٹروں کی حوصلہ افزائی ہوئی، اور انہوں نے اسے مزید وسعت دینے کا پروگرام بنایا۔ آنکھوں کے علاوہ، انسانی جسم کے دوسرے اعضاء جن کی دوسرے انسانوں میں پیوند کاری ممکن ہے، انکو محفوظ کرنے کے لئے وہاں حال ہی میں ٹشو بینک کا قیام عمل میں لایا گیا ہے، اس نئے منصوبے کے افتتاح کے موقع پر اس ادارے کے ڈائریکٹر نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ سری لنکا کے پانچ لاکھ باشندے یہ وصیّت کر چکے ہیں کہ انکی موت کے بعد ان کے جسم کے اعضاء دوسرے انسانوں کی زندگیاں بچانے کے لئے اور ان کی مصیبتیں کم کرنے کے لئے استعمال میں لائے جائیں۔ چونکہ اکثر اوقات ان اعضاء کا فوری استعمال ممکن نہیں تھا اس لئے انہیں دوسرے ملکوں کے مریضوں تک پہنچانے کے لئے ضروری تھا کہ انہیں کچھ عرصے کے لئے جدید طریقے سے محفوظ کر لیا جائے اور اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے سری لنکا میں ٹشو بینک کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔

ہمارے ہاں قدامت پسند علماء کی جانب سے انسانی اعضاء کی دوسرے انسانوں میں پیوندکاری کی اس لئے مخالفت کی جاتی ہے کہ ان کے خیال کے مطابق انسانی جسم ہر حالت میں قابلِ احترام ہے، اس لئے موت کے بعد بھی اس میں کسی قسم کی قطع و برید کرنا، مردے کی بے حرمتی کے مترادف ہے جو اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے، ہمارے ہاں ابھی تک انسانی اعضا کی پیوندکاری کا عمل تو شروع نہیں ہوا۔ البتہ اس سلسلے کی ابتدائی کڑی یعنی ایک صحت مند انسان کے جسم کا خون، بیمار کے جسم میں منتقل کرنے کا عمل کافی عرصے سے جاری ہے۔ ہمارے علماء نے اس انتقالِ خون کے عمل کی بھی مذکورہ اصول کی بنیاد پر مخالفت کی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بہت سی انسانی جانیں جو انتقالِ خون کے ذریعے بچائی جا سکتی تھیں ہلاکت کی نظر ہو گئیں۔ عوام پر علماء کے اس طرزِ عمل کا منفی اثر پڑا اور انہوں نے ان حضرات کے فتوئی کے خلاف، انتقالِ خون کے عمل سے فائدہ اٹھانا شروع کیا۔

ہمارے علماء حضرات اگر اس بارے میں قرآنی تعلیمات سے ہدایت حاصل کرتے تو انہیں اس مخالفت کی ضرورت نہ پڑتی۔ سورۃ المائدہ کی آیت ۳۲ کے حوالے سے سابقہ سطور میں

بتایا جاچکا ہے کہ قرآن مجید کی تعلیمات کی رو سے ایک انسانی زندگی کو بچانا ایسا ہے گویا کہ ساری انسانیت کو بچا لیا گیا ہے۔ انتقالِ خون کے بارے میں تو قرآن مجید میں بالکل واضح احکامات موجود ہیں ارشاد ہے:۔ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَا أُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ط اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (البقرہ - ۱۷۳)

ترجمہ:۔ یقیناً تم پر مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور جس جانور کو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کے نام پر ذبح کیا جائے حرام قرار دیا گیا ہے۔ لیکن جو شخص مجبور ہو جائے نہ زیادہ چاہنے والا اور نہ حد سے بڑھنے والا، اس پر ان چیزوں سے فائدہ اٹھانے میں کوئی گناہ نہیں

معلوم نہیں پہلے زمانے میں یہ خون کس طرح استعمال کیا جاتا تھا اور یہ خون انسانوں کا ہوتا تھا یا حیوانوں کا۔ قرآن مجید نے اس بارے میں کوئی تصریح نہیں کی۔ تاہم اسے جس طرح بھی استعمال کیا جاتا تھا اس میں نقصان کا پہلو زیادہ تھا لیکن اب تو اس خون کو مختلف آلات کے ذریعے اس خوبی سے منتقل کر دیا جاتا ہے، کہ کسی نقصان کا اندیشہ باقی نہیں رہتا۔ فقہ کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ پرانے زمانے میں علاج کے لئے خون پیا جاتا تھا۔ مذکورہ بالا آیت میں مجبوری کی حالت میں خون استعمال کرنے کی جو اجازت دی گئی ہے ہمارے فقہا نے اس کے بارے میں اپنا فتوٰی ان الفاظ میں جاری کیا۔ اگر بیمار کو کسی طبیب نے خبر دی کہ تیری شفا خون یا پیشاب یا مردار کھانے میں ہے اور اس نے دوسری مباح یعنی جائز چیزوں میں سے ان حرام چیزوں کے قائمقام کوئی چیز نہ پائی تو اس کو (ان حرام چیزوں کا) پینا اور کھانا جائز ہے۔

(فتاوی عالمگیری جلد نہم ص ۹۸ مطبوعہ شیخ غلام علی)

بعض فقہا نے تو جان بچانے کے لیئے ان حرام چیزوں کو استعمال کرنا فرض قرار دیا ہے۔ انہوں نے فتوٰی دیا کہ اگر کوئی شخص، قرآن مجید میں دی گئی اس اجازت سے فائدہ نہ اٹھائے گا تو وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سخت مجرم قرار پائے گا اور قیامت کے دن اسے دوزخ میں ڈالا جائے گا۔ حنبلی فقہ کے مشہور امام ابن قدامہ فرماتے ہیں:۔

عبداللہ سے ایسے مجبور شخص کے بارے میں دریافت کیا گیا کہ جسے جان بچانے کیلئے مردار کا گوشت دستیاب تھا لیکن اس نے نہ کھایا۔ تو انہوں نے حضرت مسروق کا یہ قول نقل کیا کہ جس شخص کی حالت بھوک کی وجہ سے اضطراری تھی اور اس نے مردار کا گوشت نہ کھایا اور نہ کوئی حرام چیز لی اور اسی حالت میں مر گیا تو وہ قیامت کے دن دوزخ میں ڈال دیا جائے گا اور یہی ابن حامد کی رائے ہے اور اس کی دلیل یہ قرآنی حکم ہے کہ تم اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ اور ایسی حالت میں مردار کھانے کو ترک کرنا، اپنے آپ کو ہلاکت

میں ڈالنے کے مترادف ہے۔

(المغنی لابن قدامتہ جلد ہشتم صفحہ ۵۹۲)

مصر کے روشن خیال عالم دین علامہ رشید رضا کو فقہ کی یہ کتاب دوسری تمام کتابوں کی نسبت زیادہ پسند تھی انہوں نے اسے نئے سرے سے ایڈٹ کر کے مفید حاشیوں کے اضافے کے ساتھ شائع کرایا۔ انہوں نے اس بارے میں اپنا یہ نوٹ بھی دیا کہ اعضاء کی پیوندکاری کوئی نیا مسئلہ نہیں۔ ہمارے فقہائے کرام نے اسے صدیوں پہلے حل کر دیا تھا یہاں تک کہ اس مقصد کے لئے انہوں نے انسانی اعضاء کی خرید و فروخت کی بھی اجازت دے دی تھی۔ شرط یہ تھی کہ اس سے انسانیت کو فائدہ پہنچ سکے۔ اس کی تائید میں انہوں نے انہوں نے امام ابن قدامتہ کا یہ فتویٰ پیش کیا۔

"اور انسان کے تمام اعضاء کی فروخت جائز ہے، کیونکہ غلام اور لونڈی کی فروخت جائز ہے اور آزاد آدمی کی فروخت اس لئے جائز نہیں کہ وہ کسی کی ملکیت نہیں اور زندہ انسان کے کاٹے ہوئے عضو کی فروخت کی بھی اجازت نہیں کیونکہ اس سے کوئی نفع نہیں ہوتا۔"

(المغنی لابن قدامتہ جلد چہارم صفحہ ۲۶۰)

علامہ رشید رضا اس فتویٰ کے نیچے لکھتے ہیں کہ انسانی اعضاء کی فروخت اس وقت جائز ہے، جب ان سے نفع اٹھایا جائے۔ اور یہ ہمارے زمانے میں ممکن ہے۔ جبکہ جلد سے ایک ٹکڑا کاٹ کر اس سے بدن کے دوسرے حصے میں پیوندکاری کر دی جاتی ہے

(ایضاً)

اس کے برعکس سری لنکا میں دوسرے انسانوں کے اعضاء کی پیوندکاری کے منصوبے کے طور پر جس ٹشو بینک کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ اس میں اعضاء کی خرید و فروخت نہیں ہوگی بلکہ سب کچھ انسانی بھلائی کے لئے بلا معاوضہ ہوگا۔

ہمارے روشن خیال علماء نے تو علامہ رشید رضا کے اس فتویٰ کو تسلیم کر لیا تھا۔ لیکن مختلف اسلامی ممالک میں قدامت پسند علماء نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور انسانی اعضاء کی پیوندکاری کی اسلام کے حوالے سے مخالفت جاری رکھی۔ ہمارے ملک میں تو وہ علماء بھی جو اپنے آپ کو روشن خیال ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اس کی مخالفت میں پیش پیش رہے ہیں ان میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب مرحوم بھی شامل تھے۔ جنہوں نے اس عمل کو خلافِ اسلام قرار دے دیا تھا۔

لیکن اس منصوبے سے نوع انسانیت کو جو فائدے پہنچتے ہیں۔ اس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ چنانچہ حال ہی میں یہ مسئلہ مکہ مکرمہ کے مشہور بین الاقوامی اسلامی ادارے

رابطہ العالم الاسلامی کے سامنے پیش کیا گیا۔ رابطہ کا ایک ادارہ فقہ اکیڈمی ہے، اس میں اس مسئلہ پہ کافی بحث مباحثہ ہوا۔ اس بحث کو سمیٹتے ہوئے فقہ اکیڈمی کے ڈائریکٹر ڈاکٹر طلال نے فیصلہ دیا کہ:-

جن علماء نے اس کے جواز کے بارے میں شرعی دلائل سے استدلال کیا ہے، وہ قابلِ ترجیح ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ زندہ انسان کی زندگی بچانے کے لئے اس میں پیوند کرنا یا کسی ناکارہ عضو کو قابل عمل بنانا، شرعاً جائز ہے۔ یہ انسانی جسم کی کرامت کے خلاف نہیں ہے کیونکہ اس میں ایک بڑی مصلحت ہے اور جس مصیبت زدہ انسان کی جان بچائی جا رہی ہے یہ اس کی اچھی مدد ہے۔ تاہم اس مقصد کے لئے مندرجہ ذیل شرائط کی پابندی لازم ہے:-

۱۔ جس زندہ شخص کا عضو استعمال کیا جا رہا ہے، وہ اس کے لئے نقصان دہ نہ ہو اور اس کی عدم موجودگی اس کے لئے ضرر رساں نہ ہو، کیونکہ شرعی اصول یہ ہے، کہ ضرر کو ضرر کے ذریعے دُور نہیں کیا جا سکتا۔

۲۔ یہ کہ متعلقہ عضو رضاکارانہ طور پہ دیا جائے، اس میں جبر کا دخل نہ ہو۔

۳۔ ایسے عضو کی پیوند کاری، مجبور مریض کے علاج کا واحد ممکن طریقہ ہو۔

۴۔ زندہ انسانوں کا عضو حاصل کرنا اور ضرورت مند کے جسم میں، اسکی پیوند کاری کے عمل کی کامیابی کا غالب حد تک یقین ہو۔

(اخبار العالم الاسلامی مکہ مکرمہ مورخہ ۲۵ فروری ۱۹۸۵ء، صہ ۵)

رابطہ العالم الاسلامی کا یہ فتویٰ، سری لنکا کے ٹشو بینک سے بھی زیادہ ترقی پسندانہ ہے، کیونکہ یہ بوقت ضرورت زندہ انسانوں کے اعضاء کی پیوند کاری کی اجازت دیتا ہے جبکہ سری لنکا کا منصوبہ اس بنیاد پہ قائم کیا گیا ہے کہ وہاں کے پانچ لاکھ باشندوں نے موت کے بعد اپنے جسموں کے مختلف اعضاء کو دوسرے انسانوں کی بھلائی کے لئے استعمال کرنے کی اجازت دے رکھی ہے، ان کا یہ عمل نوعِ انسانیت کی اعلیٰ ترین خدمت ہے اور دینِ اسلام اس عمل کی نہ صرف یہ کہ واضح اجازت دیتا ہے۔ بلکہ اسے مستحسن نظروں سے بھی دیکھتا ہے۔

ان تفصیلات کے بعد، ہمارے اخبارات کو نیم تعلیمیافتہ علماء کی مخالفت سے گھبرانا نہیں چاہیئے بلکہ انسانیت کی خدمت کے لئے سری لنکا کے اس ٹشو بینک کی تفصیلات اپنے قارئین کے سامنے پیش کرنی چاہئیں تاکہ ضرورتمند انسان اس سہولت سے فائدہ اٹھا کر دوبارہ زندگی حاصل کر سکیں۔

حقائق و عبر

جماعت اسلامی کی انتخابی پالیسی

ہفت روزہ المنبر فیصل آباد اپنی ایک حالیہ اشاعت، ۲۰ شوال ۱۴۰۵ھ میں جماعتِ اسلامی کی ایک کتاب بعنوان جماعتِ اسلامی کی انتخابی جدوجہد" سے یہ اقتباس نقل کیا ہے:۔

"ہمارے نزدیک سب سے بڑا خائن وہ شخص ہے جو اس چیز کا طالب ہو۔ رسولِ برحق کے یہ ارشادات بجائے خود حکمت و دانائی کے جوہر تھے جن کی سچائی پر عقلِ عام گواہی دے رہی تھی، لیکن اب تو زمانے کے تجربات نے بھی ان پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ اب ہم کو اس امر میں کوئی شک باقی نہیں رہا ہے کہ ہماری اجتماعی زندگی اور قومی سیاست کو جن چیزوں نے سب سے بڑھ کر گندا کیا ہے، ان میں سے ایک یہ امیدواری اور پارٹی ٹکٹ کا طریقہ ہے۔ اسی بناء پر جماعت اسلامی نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس ناپاک طریق انتخاب کی جڑ کاٹ دی جائے۔ یہ جماعت نہ اپنے پارٹی ٹکٹ پر آدمی کھڑے کرے گی نہ اپنے ارکان کو آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہونے کی اجازت دے گی۔ نہ ایسے شخص کی تائید کرے گی جو خود امیدوار ہو۔ اور اپنے لئے آپ ووٹ حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ خواہ انفرادی طور پر یا کسی پارٹی کے ٹکٹ پر۔ یہی نہیں بلکہ جماعت اپنی انتخابی جدوجہد میں خاص طور پر یہ بات عوام الناس کے ذہن نشین کرے گی کہ امیدوار بن کر اٹھنا اور اپنے حق میں ووٹ مانگنا آدمی کے غیر صالح اور نااہل ہونے کی پہلی اور کھلی ہوئی علامت ہے۔ ایسا آدمی جب کبھی اور جہاں کہیں سامنے آئے لوگوں کو فوراً سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ ایک خطرناک شخص ہے۔ اس کو ووٹ دینا اپنے حق میں کانٹے بونا ہے۔

تحریفِ حدیث

ہفت روزہ اہلحدیث لاہور، فرقہ اہلحدیث کا ترجمان ہے۔ یہ اخبار رسول اللہؐ پر درود کو ہمیشہ ان الفاظ میں لکھتا ہے:۔

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم　　(اشاعت ۱۴ اگست صفحہ ۴)

عربی زبان کے مطابق درود کی یہ عبارت غلط قرار پاتی ہے۔ کیونکہ مجرور ضمیر پر عطف نہیں

ہو سکتا بلکہ اس کے لئے علیحدہ حرف جار استعمال کرنا پڑتا ہے۔ یہاں علیہ میں 'ہ' کی ضمیر پہ 'علیٰ' حرف جار ہے اس لئے اگر اس کے ساتھ 'آلہٖ' کا اضافہ کرنا مقصود ہے تو اس سے پہلے 'علیٰ' حرف جار دوبارہ لانا لازمی ہے' اس صورت میں درود کی صحیح عبارت یوں بنے گی :

صلّی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ وسلم۔

لیکن کچھ لوگوں کا اصرار ہے کہ رسولؐ اللہ اور اس کی آلؑ ایک ہی وجود ہے۔ اس لئے وہ حرف جار 'علیٰ' کا دوبارہ استعمال نہیں کرتے۔ لیکن اس اصرار کی زد ختم نبوت کے عقیدے پر پڑتی ہے۔ جس کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں آنا۔

حیرت کی بات ہے کہ اہل حدیث علماء کو عربی زبان کی اتنی شد بد بھی نہیں کہ وہ صحیح اور غلط درود میں فرق کر سکیں۔ بلکہ ہفت روزہ اہلحدیث میں جو احادیث نقل کی جاتی ہیں ان میں بھی درود کی یہی غلط عبارت درج کی جاتی ہے۔ اس طرح وہ تحریفِ حدیث کے مرتکب ہوتے ہیں۔

تحریکِ اسلامی کا پیغام

تحریکِ اسلامی (جماعتِ اسلامی) کے امیر میاں طفیل محمد صاحب نے سعودی عرب کے اپنے حالیہ دورہ میں ندوۃ العالم للشباب الاسلامی میں تقریر کرتے ہوئے جو کچھ فرمایا، جماعت اسلامی کے ترجمان ہفت روزہ ایشیا نے اسے اپنی ۱۸ اگست ۱۹۸۵ء کی اشاعت میں یوں نقل فرمایا ہے :-

میاں طفیل محمد نے کہا کہ تحریکِ اسلامی کا صرف ایک پیغام ہے خواہ وہ ہندوستان میں ہو، پاکستان میں، بنگلہ دیش میں، سری لنکا یا کسی اور ملک میں، وہ پیغام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنا خلیفہ بنا کر دنیا میں بھیجا ہے اور اس پر اس نسبت سے کچھ ذمہ داریاں ڈالی ہیں، انسان کو ان ذمہ داریوں کے پورا کرنے کیلئے تیار کرنا ہے تاکہ اللہ کی زمین فساد، خونریزی ہنگاموں سے پاک ایک ایسی جگہ ہو جہاں انصاف کیا جائے، کسی کا حق نہ مارا جائے، چھوٹے بڑے کو اپنے منصب اور مرتبہ کیمطابق امن و چین نصیب ہو اور خالق کائنات کا وہ مشن پورا ہو جس کے لئے انسان کو یہاں بھیجا گیا ہے۔ جو لوگ اللہ کے اور انبیاء علیہ السلام کے بتائے ہوئے راستہ پر چلیں گے وہ یومِ آخرت کو کامران و سرخرو ہوکر اپنے آقا کے حضور پیش ہوں گے اور جو نافرمانی اور طاغوت کی زندگی گذاریں گے وہ جہنم کا ایندھن بنیں گے۔ تحریک کا منشاء صرف یہ ہے کہ انسانیت کو نیکی کا راستہ دکھایا جائے اور بدی سے روکا جائے۔ یہی خلیفہ بننے کا اہم تقاضا ہے۔ ہم میں سے ہر کوئی چاہے وہ امیر ہو یا غریب، بادشاہ ہو یا فقیر،

(اس کا باقی حصہ صفحہ (۳۱) پہ ملاحظہ فرمائیں)

تحریکِ اسلامی اور جمہوریت

آج کل تحریکِ اسلامی (سابقہ جماعتِ اسلامی) نے ملکِ عزیز میں جمہوریت کی بحالی کے لئے خاموش مظاہروں کا سلسلہ جاری کر رکھا ہے۔ جمہوریت کے بارے میں ان کی اصل رائے کیا ہے۔ علامہ پرویز صاحب نے آج سے اکتیس سال پہلے اس کا خوبصورت تجزیہ کیا تھا۔ جسے قارئینِ طلوعِ اسلام کی دلچسپی کے لئے دوبارہ پیش کیا جا رہا ہے۔

اس مضمون میں کئی مقامات پر مولانا مودودی صاحب کا حوالہ دیا گیا ہے۔ جو اب مرحوم ہو چکے ہیں۔ (ادارہ)

"صحیح حکمتِ عملی یہ نہیں کہ پہلے سے متعین کر لیا جائے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ حکمتِ عملی یہ ہے کہ حسب موقع جو صورت اپنے فائدے کی نظر آئے اسے اختیار کر لیا جائے"۔

یہ الفاظ ہیں اٹلی کے مشہور مدبر میکیاؤلی کے، جسے عصرِ حاضر کی مغربی سیاست کا امام تصور کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس ایک اور سیاست بھی ہے جس کے منشور میں کہا گیا ہے:-

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَٰتِهِ۔ (6/116)

(تیرے رب کی بات سچائی اور عدل کے ساتھ تکمیل تک پہنچ گئی، اب باتوں کو بدلنے والا کوئی نہیں۔

یہ اسلام کی سیاست ہے جس کے اصول وقتی مصلحتوں کے تحت بار بدلتے نہیں۔ وہ ہمیشہ اٹل اور غیر متبدل رہتے ہیں، جماعتِ اسلامی کے امیر سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ مغرب کی ابلیسی سیاست کے بجائے اسلامی سیاست کے علمبردار ہیں اور اسی سیاست کو مملکتِ پاکستان میں قائم کرنا ان کا اور ان کی جماعت کا مشن ہے۔ ہم دیکھنا یہ چاہتے ہیں کہ ان کا یہ دعویٰ کس حد تک صداقت پر مبنی ہے۔ کیا وہ اسلامی سیاست کے نقیب ہیں یا مغرب کی میکیاؤلی سیاست کے علمبردار، جس کے اصول ہر مصلحت کے ساتھ بدلتے چلے جاتے ہیں۔ اس نشست میں ہم ان کی بساطِ سیاست کے صرف ایک گوشے کو سامنے لانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے آج کل ایک مہم شروع کر رکھی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ

نئی مہم

(۱) ملک کے ہر بالغ کو رائے دینے کا حق دیا جائے۔ اور
(۲) ملک میں جمہوری نظام قائم کیا جائے۔

شق نمبر ۱ سے مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کا محض بالغ ہو جانا اسے اس کا حق دار بنا دیتا ہے کہ وہ ملک کے سیاسی معاملات میں اپنی رائے دے سکے۔ اور شق نمبر ۲ کے معنی یہ ہیں کہ اس قسم کے ووٹروں کی کثرت رائے سے جو لوگ پارلیمان کے ممبر منتخب ہوں انہیں قوم کا نمائندہ سمجھا جائے۔ اور جو فیصلے ان کی اکثریت کرے وہ ملک کا قانون بن جائیں۔

مودودی صاحب کا کہنا یہ ہے کہ اس طریق سے ملک کا نظام اسلامی ہو جائے گا۔ وہ اس سلوگن کو بار بار دہرائے چلے جا رہے ہیں کہ اسلام اور جمہوریت لازم ملزوم ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے نزدیک جمہوریت اسلام کا غیر متبدل اصول ہے اور اس کے خلاف ہر تصور غیر اسلامی ہے۔ ہم دیکھنا یہ چاہتے ہیں کہ اس جمہوریت کے متعلق مودودی صاحب اس سے پہلے کیا کہا کرتے تھے۔

واضح رہے کہ اس وقت ہم نہ اس بحث کو چھیڑنا چاہتے ہیں کہ جمہوری نظام کے معنی کیا ہیں، اسلام سے اس کا تعلق کیا ہے، اور صحیح اسلامی نظام کہتے کسے ہیں؟ ہم اس وقت صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مودودی صاحب آج جس چیز کو عین اسلام قرار دے کر عالمگیر مہم چلا رہے ہیں وہ اس کے متعلق ابھی کل تک کیا فرمایا کرتے تھے؟

٭

تحریک پاکستان کے دوران میں صورت حال یہ تھی کہ قائد اعظمؒ کی قیادت میں مسلم لیگ کا مطالبہ یہ تھا کہ ہندوستان کے جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے انہیں ہندوستان سے الگ کر دیا جائے، تا کہ وہاں کے مسلمان اپنے نظریۂ زندگی کے مطابق اسلامی انداز کی حکومت قائم کرنے کے قابل ہو سکیں۔ ہندوؤں کی کوشش یہ تھی کہ مسلمانوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو مسلم لیگ سے الگ کر کے دنیا پر اس حقیقت کو واضح کر دیا جائے کہ مسلمانوں کی اکثریت اس مطالبہ کے ہمنوا نہیں۔ انہیں اس مذموم کوشش میں ناکامی ہوئی اور مسلمانوں کی بہت بھاری اکثریت اس مطالبہ کی تائید کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ مودودی صاحب آگے بڑھے اور انہوں نے ہندوؤں سے کہا کہ تم اس صورت حالات سے گھبراؤ نہیں۔ اگر مسلمانوں کی اکثریت اس مطالبہ کے ہمنوا ہے تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ میں ابھی یہ واضح کئے دیتا ہوں کہ ان مسلمانوں کی حیثیت کیا ہے اور اسلام کی رو سے اس دعویٰ کی حقیقت کیا کہ اکثریت کا مطالبہ بالضرور مان لینے کے قابل ہوتا ہے چنانچہ انہوں نے وہاں اپنی اس مہم کو جاری کیا کہ اکثریت کا فیصلہ کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ ذرا غور سے سنئے کہ وہ اس باب میں کیا کہتے تھے اور اس طرح ہندوؤں کو وہ کس طرح تقویت پہنچاتے چلے جا رہے تھے انہوں نے اپنے سلسلۂ مضامین بہ عنوان "سیاسی کشمکش" میں لکھا۔[1]

[illegible]

مسلم اکثریت پر حملہ

ایک قوم کے تمام افراد کو محض اس وجہ سے کہ وہ نسلاً مسلمان ہیں، حقیقی معنی میں مسلمان فرض کر لینا اور یہ امید رکھنا کہ ان کے اجتماع سے جو کام بھی ہو گا اسلامی اصول ہی پر ہو گا۔ پہلی اور بنیادی غلطی ہے یہ انبوہِ عظیم جس کو مسلمان قوم کہا جاتا ہے، اس کا حال یہ ہے کہ اس کے ۹۹۹ فی ہزار افراد نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں نہ حق اور باطل کی تمیز سے آشنا ہیں۔ نہ ان کا اخلاقی نقطۂ نظر اور ذہنی رویہ اسلام کے مطابق تبدیل ہوا ہے۔ باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے کو بس مسلمان کا نام ملتا چلا آ رہا ہے اس لئے یہ مسلمان ہیں۔ نہ انہوں نے حق کو حق جان کر قبول کیا ہے نہ باطل کو باطل جان کر اسے ترک کیا ہے۔ ان کی کثرت رائے کے ہاتھ میں باگیں دے کر اگر کوئی شخص یہ امید رکھتا ہے کہ گاڑی اسلام کے راستے پر چلے گی تو اس کی خوش فہمی قابلِ داد ہے۔ (ترجمان القرآن محرم ۱۳۶۰ھ ص ۲۷)

اس کے بعد انہوں نے یہ لکھا کہ مسلم لیگ والے جو یہ کہتے ہیں کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہو گی۔ وہاں ہم اسلامی انداز کی حکومت قائم کرنے کے قابل ہو سکیں گے، بہت بڑے فریب پر مبنی ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:۔

اسلامی نصب العین ناممکن ہو گا

اس کے بعد اس طریقہ کا جائزہ لیجئے جس سے یہ بزعم خود اسلامی نصب العین تک پہنچنے کی امید رکھتے ہیں ان کی تجویز یہ ہے کہ پہلے اسی جمہوری دستور کے مطابق جو انگریزی حکومت یہاں نافذ کرنا چاہتی ہے، مسلم اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کی اپنی حکومت قائم ہو جائے، پھر کوشش کی جائے گی کہ یہ قومی حکومت اسلامی نظامِ حکومت میں بتدریج تبدیل ہو جائے[1]

---

[1] ”اس موقع پر یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مسلم لیگ کے کسی ریزولیوشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی کی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمحِ نظر پاکستان میں اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنا ہے۔ برعکس اس کے ان کی طرف سے بصراحت اور بہ تکرار جس چیز کا اظہار کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ان کے پیشِ نظر محض ایک ایسی جمہوری حکومت ہے جس میں دوسری غیر مسلم قومیں بھی حصہ دار ہوں مگر اکثریت کے حق کی بنا پر مسلمانوں کا حصہ غالب ہو۔ بالفاظ دیگر ان کے مطمئن کرنے کے لئے صرف اتنی بات کافی ہے کہ ہندو اکثریت کے تسلط سے وہ صوبے آزاد ہو جائیں جہاں مسلمانوں کی کثرت ہے۔ باقی رہا نظامِ حکومت تو وہ پاکستان میں بھی ویسا ہی ہو گا جیسا ہندوستان میں ہو گا۔ ان کے اس نصب العین پر جب یہ اعتراض کیا گیا کہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت اسلامی نقطۂ نظر سے غیر مسلموں کی کافرانہ حکومت کے مقابلہ میں کچھ بھی قابلِ ترجیح نہیں ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ قابلِ لعنت ہے تو ذمہ دار لیڈروں میں سے تو کسی نے اس کا جواب نہ دیا، البتہ جو لوگ پاکستانی حلقوں کی صفِ آخر میں شمار ہوتے ہیں اور جن کی کوئی ذمہ دار حیثیت نہیں ہے انہوں نے کہنا شروع کیا کہ مسلم اکثریت کو جب خود اختیاری حاصل ہو جائے گی تب ہم نظامِ حکومت کو بدلنے کی کوشش کریں گے۔“ (ایضاً ص ۲۷)

لیکن یہ ویسی ہی غلطی ہے جیسی "آزادیٔ ہند" کو مقدم رکھنے والے حضرات کر رہے ہیں۔ان کی تجویز پر مجھے جو اعتراضات ہیں بعینہٖ وہی اعتراضات ان کی تجویز پر بھی ہیں۔ان کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں حکومتِ جمہور کے اصول پر خود مختار حکومت کا قیام آخر کار حاکمیت رب العالمین کے قیام میں مددگار ہو سکتا ہے۔ (ایضاً ص ۲۷)

اس کے نیچے انہوں نے فٹ نوٹ میں لکھا تھا کہ "پاکستان میں مسلمانوں کی کافرانہ حکومت اسلامی نقطۂ نظر سے غیر مسلموں کی کافرانہ حکومت کے مقابلے میں کچھ بھی قابلِ ترجیح نہیں ہو گی۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ قابلِ لعنت (ہو گی)۔"

مسلم سوسائٹی یا چڑیا گھر

وہ ان مسلمانوں کو نا مسلم ہی نہیں بلکہ جانور کہتے تھے۔ان کے الفاظ یہ تھے:۔

غرض آپ اس نام نہاد مسلم سوسائٹی کا جائزہ لیں گے تو اس میں آپ کو بھانت بھانت کا مسلمان نظر آئے گا۔مسلمان کی اتنی قسمیں ملیں گی کہ آپ شمار نہ کر سکیں گے۔یہ ایک چڑیا گھر ہے جس میں چیل، کوے، گدھ، بٹیر، تیتر اور ہزاروں قسم کے جانور ہیں۔اور ان میں سے ہر ایک "چڑیا" ہے کیونکہ چڑیا گھر میں داخل ہے۔

(ترجمان القرآن۔ ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ ص ۲۷)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ہے کہ میری امت کا سوادِ اعظم کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہو گا۔ تم اس کا ساتھ دو۔جب کسی نے مودودی صاحب کی توجہ اس حدیث کی طرف منعطف کرائی تو انہوں نے جواب میں کہا:۔

سوادِ اعظم کا مفہوم

بعض لوگ اس دھوکے میں مبتلا ہیں کہ مسلمانوں کی اکثریت کا نام "سوادِ اعظم" ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی ہے کہ "سوادِ اعظم" کا ہمیشہ ساتھ دو۔لہٰذا مسلمانوں کی اکثریت جس سیاسی پارٹی کی حامی اور جس قیادت کی متبع ہے اس کے ساتھ رہنا ضروری ہے لیکن یہ ارشادِ نبویؐ کی سراسر غلط تعبیر ہے۔نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس سوادِ اعظم کے ساتھ رہنے کا حکم دیا ہے اس سے مراد دراصل ان مسلمانوں کی اکثریت ہے جن کے اندر اسلامی شعور موجود ہو۔جو حق اور باطل کی تمیز رکھتے ہوں اور جن کو اسلام کی روح اور اس کے بنیادی اصولوں سے کم از کم اتنی واقفیت ضرور ہو کہ اسلام اور غیر اسلام میں فرق کر سکتے ہوں۔ ایسے مسلمانوں کی اکثریت کبھی باطل پر مجتمع نہیں ہو سکتی اور اگر وہ کبھی کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو بھی جائے تو اس پر زیادہ دیر تک جمی نہیں رہ سکتی۔اسی بناء پر حضورؐ نے سوادِ اعظم کا ساتھ دینے کی تاکید فرمائی ہے مگر جو لوگ ان ضروری صفات سے عاری ہیں اور جن میں کھرے اور کھوٹے کی بالکل ابتدائی پرکھ بھی نہ ہو، ان کے ہلڑ کا نام ہرگز اسلامی سوادِ اعظم

نہیں ہے، نہ ان کی جماعت، اسلامی مفہوم کے اعتبار سے جماعت ہے نہ ان کی امارت اسلامی اصطلاح کی رو سے امارت ہے نہ ان کی اس امارت کو، کسی حیثیت سے سمع و طاعت کا حق پہنچتا ہے۔ محض لفظ مسلمان سے دھوکا کھا کر جو لوگ جاہلیت کی پیروی کرنے والوں کی تنظیم کو تنظیم سمجھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس نوعیت کی کوئی تنظیم اسلامی نقطۂ نظر سے مفید ثابت ہوگی ان کی کند ذہنی ماتم کی مستحق ہے۔

(ترجمان القرآن بابت ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ صـ ۷۳)

محض مردم شماری کے رجسٹروں میں اسی رسالے میں انہوں نے لکھا:۔

"ان وجوہ سے وہ عظیم الشان تعداد جو ہم کو مردم شماری کے رجسٹروں میں نظر آتی ہے، اسلامی اغراض کے لئے قریب قریب بالکل بیکار ہو چکی ہے۔ اس تعداد کے بھروسہ پر اگر کچھ کیا جائے گا تو سخت مایوسی سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ جو امید وابستہ کی جاسکتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ اگر اسلام از سر نو ایک زندہ تحریک کی حیثیت سے اٹھے اور شیطانی قوتوں کے مقابلہ میں اپنے اصول کی حکمرانی و فرماں روائی قائم کرنے کے لئے نبرد آزما ہو تو شاید غیر مسلموں کی بہ نسبت ان مسلمانوں میں سے اس کو کچھ زیادہ والنیٹر نسبتاً زیادہ آسانی کے ساتھ مل سکیں گے"۔ (ایضاً صـ ۵)

اس قسم کے مسلمانوں کی آراء سے جس قسم کے ممبر منتخب ہوں گے اور یہ ممبر جس قسم کی حکومت قائم کر سکیں گے اس کے متعلق انہوں نے کہا:۔

مسلم اکثریت کی کافرانہ حکومت جہاں ایسے لوگوں کی اکثریت ہو وہاں کبھی یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ عام انتخاب میں ان کے ووٹوں سے وہ صالحین منتخب ہوں گے جو منہاج نبوت پر حکومت کرنے والے ہوں۔ جمہوری انتخاب کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے دودھ کو بلو کر مکھن نکالا جاتا ہے۔ اگر دودھ زہریلا ہو تو اس سے جو مکھن نکلے گا قدرتی بات ہے کہ وہ دودھ سے زیادہ زہریلا ہوگا۔ اسی طرح اگر سوسائٹی بگڑی ہوئی ہو تو اس کے ووٹوں سے وہی لوگ منتخب ہو کر برسر اقتدار آئیں گے جو اس سوسائٹی کی خواہشات نفس سے سند قبولیت حاصل کر سکیں گے۔ پس جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومت الٰہی قائم ہو جائیگی ان کا گمان غلط ہے۔ دراصل اس کے نتیجہ میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ صرف مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی۔ اسی کا نام حکومت الٰہی رکھنا اس پاک نام کو ذلیل کرنا ہے"

(ترجمان القرآن محرم ۱۳۶۰ھ صـ ۲۹)

آپ نے غور فرمایا کہ اُس وقت مودودی صاحب جمہوری نظام کے متعلق کیا فرماتے تھے۔ وہ فرماتے یہ تھے کہ "اس کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہوگا۔ وہ صرف مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی"۔ اور سنیے! اسی پرچے میں آگے چل کر وہ لکھتے ہیں :۔

جمہوری سٹیٹ اسلام کے منافی ہوگا

اب یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ جو قومی اسٹیٹ جمہوری طرز پر تعمیر ہوگا وہ اس بنیادی اصلاح میں آخر کسطرح مددگار ہو سکتا ہے۔ جمہوری حکومت میں اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں آتا ہے جن کو ووٹروں کی پسندیدگی حاصل ہو۔ ووٹروں میں اگر اسلامی ذہنیت اور اسلامی فکر نہیں ہے، اگر وہ صحیح اسلامی کریکٹر کے عاشق نہیں ہیں، اگر وہ اس بے لاگ عدل اور ان بے لچک اصولوں کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں جن پر اسلامی حکومت چلائی جاتی ہے تو ان کے ووٹوں سے کبھی "مسلمان" قسم کے آدمی منتخب ہوکر پارلیمنٹ یا اسمبلی میں نہیں آسکتے۔ اس ذریعہ سے تو اقتدار انہی لوگوں کو ملے گا جو مردم شماری کے رجسٹر میں چاہے مسلمان ہوں مگر اپنے نظریات اور طریق کار کے اعتبار سے جن کو اسلام کی ہوا بھی نہ لگی ہو"۔ (ایضاً صفحہ ۶)

وہ ان مسلمانوں کے متعلق جن کے جمہوری نظام سے پاکستان میں آزاد حکومت قائم ہونی تھی کہتے تھے:۔

کافر ٹائپ مسلمان

یہاں جس قوم کا نام مسلمان ہے وہ ہر قسم کے رطب و یابس لوگوں سے بھری ہوئی ہے، کیریکٹر کے اعتبار سے جتنے ٹائپ کافر قوموں میں پائے جاتے ہیں اتنے ہی اس قوم میں بھی موجود ہیں۔ عدالتوں میں جھوٹی گواہیاں دینے والے جس قدر کافر قومیں فراہم کرتی ہیں غالباً اسی تناسب سے یہ بھی فراہم کرتی ہے رشوت، چوری، زنا، جھوٹ اور دوسرے تمام ذمائم اخلاق میں یہ کفار سے کچھ کم نہیں ہے۔ پیٹ بھرنے اور دولت کمانے کے لئے جو تدبیریں کفار کرتے ہیں، وہی اس قوم کے لوگ بھی کرتے ہیں۔ ایک مسلمان وکیل جان بوجھ کر حق کے خلاف اپنے موکل کی پیروی کرتے ہوئے اتنا ہی خدا کے خوف سے خالی ہوتا ہے جتنا ایک غیر مسلم وکیل ہوتا ہے۔ ایک مسلمان رئیس دولت پاکر یا ایک مسلمان عہدہ دار حکومت پاکر وہی سب کچھ کرتا ہے جو غیر مسلم کرتا ہے۔ یہ اخلاقی حالت جس قوم کی ہو اس کی تمام کالی اور سفید بھیڑوں کو جمع کرکے ایک منظم گلہ بنادینا اور سیاسی تربیت سے ان کو لومڑی کی ہوشیاری سکھانا یا فوجی تربیت سے ان میں بھیڑیئے کی درندگی پیدا کرنا، جنگل کی فرمانروائی حاصل کرنے کیلئے تو ضرور مفید ہو سکتا ہے، مگر میں نہیں سمجھتا کہ اس سے اعلائے کلمۃ اللہ کس طرح ہو سکتا ہے، کون انکی اخلاقی برتری تسلیم کرے گا۔ کس کی نگاہیں اس کے سامنے عزت سے جھکیں گی۔ کس کے دل میں انہیں دیکھ کر اسلام کے لئے احترام کا جذبہ پیدا ہوگا ؟ کہاں انکے

"انفاس قدسیہ" سے "یدخلون فی دین اللہ افواجاً" کا منظر دکھائی دے سکے گا۔ کس جگہ ان کی روحانی امامت کا سکہ جمے گا اور زمین پر لیسنے والے کہاں ان کا خیر مقدم اپنے نجات دہندوں کی حیثیت سے کریں گے؟ اعلائے کلمتہ اللہ جس چیز کا نام ہے اس کے لئے تو صرف ان کارکنوں کی ضرورت ہے جو خدا سے ڈرنے والے اور خدا کے قانون پر فائدہ و نقصان کی پرواکئے بغیر جمنے والے ہوں۔ خواہ وہ اس نسلی مسلمان قوم میں سے ملیں یا کسی دوسری قوم سے بھرتی ہو کر آئیں۔ ایسے دس آدمی اس مقصد کے لئے زیادہ قیمتی ہیں بہ نسبت اس کے کہ وہ انبوہ جس کا میں اوپر ذکر کر آیا ہوں، ۲۵ لاکھ یا پچاس لاکھ کی تعداد میں بھرتی ہو جائے۔ اسلام کو تانبے کے ان سکوں کا خزانہ مطلوب نہیں ہے جن پر اشرفی کا ٹھپہ لگا یا گیا ہو۔ وہ سکے کے نقوش دیکھنے سے پہلے یہ دریافت کرتا ہے کہ ان نقوش کے نیچے خالص سونے کا جوہر بھی ہے یا نہیں۔ ایسا سکہ ان جعلی اشرفیوں کے ڈھیر سے اس کے نزدیک زیادہ قیمتی ہے۔ (ایضاً صہ۵۸)

کثرت وقلت مغالطہ ہے

وہ برملا کہتے تھے کہ "کثرت وقلت" کا سوال بہت بڑا مغالطہ ہے اس لئے کہ جو جماعتیں کسی طاقتور نظریہ اور جاندار اجتماعی فلسفہ کو لے کر اٹھتی ہیں وہ ہمیشہ قلیل التعداد ہی ہوتی ہیں اور قلت تعداد کے باوجود بڑی بڑی اکثریتوں پر حکومت کرتی ہیں۔ روسی کمیونسٹ پارٹی کے ارکان کی تعداد اس وقت صرف ۳۲ لاکھ ہے اور انقلاب کے وقت اس سے بہت کم تھی مگر اس نے ۱۷ کروڑ انسانوں کو مسخر کر لیا۔ مسولینی کی فاشسٹ پارٹی صرف ۴ لاکھ ارکان پر مشتمل ہے اور روم پر مارچ کرتے وقت ۳ لاکھ تھی مگر یہ قلیل تعداد ساڑھے چار کروڑ اطالوی باشندوں پر چھا گئی۔ یہی حال جرمنی کی نازی پارٹی کا ہے۔ اگر قدیم زمانے کی مثالیں خود اسلامی تاریخ سے دی جائیں تو ان کو یہ کہہ کر ٹالا جا سکتا ہے کہ وہ زمانہ گزر گیا اور وہ حالات بدل گئے۔ لیکن یہ تازہ مثالیں آپ کے اسی زمانہ کی موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ قلت آج بھی حکمران بن سکتی ہے بشرطیکہ وہ اسی طرح مجاہدہ کرے جس طرح ایک اصول اور ایک مسلک رکھنے والی جماعت کیا کرتی ہے۔ اور محدود اغراض کے لئے لڑنے کے بجائے ایسے اصولوں کے لئے لڑے جو لوگوں کی زندگی کے مسائل کو حل کرنے والے، دلوں اور دماغوں کو اپیل کرنے والے اور انسانی توجہات کو اس جماعت کی طرف کھینچنے والے ہوں (ترجمان القرآن، ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ صہ۴۸)

نصریحات بالا سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ تشکیل پاکستان سے پہلے مودودی صاحب کا اعلان یہ تھا کہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے :۔

(۱) موجودہ پیدائشی مسلمان بالکل بیکار ہیں ۔
(۲) ان کی اکثریت کی آراء سے جو جمہوری نظام قائم ہوگا وہ کبھی اسلامی نہیں ہوسکتا ۔
پاکستان وجود میں آگیا۔ اور وہی مسلمان جن کے متعلق مودودی صاحب کے ارشادات آپ ابھی ابھی دیکھ چکے ہیں سمٹ کر اس خطۂ زمین میں آبسے تو مودودی صاحب نے ترجمان القرآن کے سب سے پہلے پرچے میں جو یہاں آکر شائع ہوا تحریر فرمایا کہ :۔

نئی قلابازیاں

اس ملک کی اکثریت ایمانداری کے ساتھ یہ رائے رکھتی ہے کہ اسلام کے اصولوں کی پیروی میں پاکستان کے باشندوں کی فلاح ہے۔ اس کو یہ حق ہونا چاہیئے کہ ملک کا نظام اس کی رائے کے مطابق بنے ۔
(ترجمان القرآن جون ۱۹۴۸ء صفحہ ۵۸)

یہ جون ۱۹۴۸ء کا قصہ ہے ۔ ظاہر ہے کہ یہ وہی "مردم شماری کے رجسٹر کے پیدائشی مسلمان" تھے جن کے متعلق وا اگست سے اس بار تک مودودی صاحب چلا چلا کر کہہ رہے تھے کہ یہ بے ایمان ہیں، منافق ہیں، بد کردار ہیں، ان کی کثرت رائے سے جو حکومت قائم ہوگی وہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی بلکہ اس سے بھی بدتر۔ دنیا حیران تھی کہ انہی مسلمانوں کے متعلق اتنی جلدی مودودی صاحب کی رائے میں ایسا انقلاب کیوں آگیا ؟ لیکن اس "کیوں" کا جواب تلاش کرنا کچھ بھی مشکل نہیں تھا۔ مودودی صاحب نے پہلا رویہ رکھا کہ پاکستان کے مسلمانوں کی اکثریت یہاں اسلامی نظام قائم کرنا چاہتی ہے۔ اور اسلامی نظام اور کوئی قائم نہیں کرسکتا۔ اس لئے ملک کا اقتدار ہمارے حوالے کردو۔ خود انہی حضرات کے الفاظ ملاحظہ فرمائیے ۔ انہوں نے جولائی ۱۹۴۸ء میں تحریر فرمایا :۔

مسلم عوام کے متعلق نئی رائے

"اس وقت ہمارے سامنے ایک بہت بڑے کام کا پروگرام ہے ۔ ہمیں پاکستان میں اسلام کی حکومت قائم کرنی ہے اور یہ کام بہت بڑی جدوجہد کا مطالبہ کرتا ہے۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد ہمارے ملک کی صورتِ حال بالکل بدل گئی ہے ۔ اب اس ملک کے لوگ اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے میں پوری طرح مختار ہیں۔ یہاں کے باشندوں کو اب یہ طے کرنا ہے کہ وہ اپنے لئے کس طریقِ زندگی کو، کس اصولِ اخلاق کو اور کس نظامِ حکومت کو پسند کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں آپ عنقریب دیکھیں گے کہ اس ملک میں ایک شدید کشمکش برپا ہونے والی ہے۔ ایک طرف نام نہاد مدعیانِ اسلام ہیں جن کو صرف اسلام کا نام باپ دادا سے ورثہ میں ملا ہے۔ لیکن اس کو طریقِ زندگی کی حیثیت سے انہوں نے نہ قبول کیا ہے نہ قبول کرنے پر تیار ہیں۔ اسلام کے نام پر جو حقوق حاصل ہوسکتے ہیں انہیں تو وہ حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن جن پابندیوں کا اسلام مطالبہ کرتا ہے۔ ان سے وہ خود بھی آزاد رہنا چاہتے ہیں اور ملک کو بھی آزاد رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ مسلمانوں کے اوپر کافرانہ حکومت قائم کرنے اور کافرانہ قوانین جاری کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ دوسری طرف ان

کے مقابلہ میں وہ سب لوگ ہیں جو اسلام کو اپنے طریق زندگی کی حیثیت سے پسند کرتے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ اس ملک میں اسلام کی حکومت قائم ہو۔ اور اسلام کا قانون جاری ہو۔ ان دونوں طاقتوں کے درمیان عنقریب ایک کشمکش رونما ہونے والی ہے۔

(ترجمان القرآن جولائی سنہ ۱۹۴۸ء صہ ۲۴)

اور سنیئے آپ دیکھ چکے ہیں کہ جمہوریت کے متعلق مودودی صاحب کی رائے کیا تھی یہاں پہنچتے ہی انہوں نے فرمایا:۔

یہ دور چونکہ جمہوریت کا ہے اس لئے حکومت کے مسلک کا انحصار عوام کی رائے پر ہوگا۔

(ترجمان القرآن جولائی سنہ ۱۹۴۸ء صہ ۲۵)

جب مودودی صاحب سے یہ کہا گیا کہ آپ ہندوستان میں کل تک یہ فرماتے تھے کہ صحیح اسلامی نظام قائم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ لوگوں کے قلب و دماغ میں اسلامی انقلاب پیدا کیا جائے لیکن اب آپ یہ فرماتے ہیں کہ جس قسم کے بھی یہ لوگ ہیں، انہی کی کثرتِ رائے سے حکومت قائم کر لی جائے تو آپ اصلاحِ خلق کا جو پروگرام لے کر اٹھے تھے وہ پروگرام کسطرح پورا ہوگا؟ اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا:۔

ہائے اقتدار

اصلاحِ خلق کی کوئی سکیم بھی حکومت کے اختیارات پر قبضہ کئے بغیر نہیں چل سکتی۔ جو کوئی حقیقت میں خدا کی زمین سے فتنہ فساد کو مٹانا چاہتا ہو اور واقعی یہ چاہتا ہو کہ خلقِ خدا کی اصلاح ہو تو اس کے لئے محض واعظ اور ناصح ہو کر کام کرنا فضول ہے۔ اس کے لئے اٹھنا چاہیئے۔ اور غلط اصول کی حکومت کا خاتمہ کر کے غلط کار لوگوں کے ہاتھ سے اقتدار چھین کر، صحیح اصولؔ اور صحیح طریقے کی حکومت قائم کرنی چاہیئے۔ (خطبات صہ ۲۳۱)

انہوں نے کہا کہ ہم پہ جہاد فرض ہے اور جہاد کے معنی یہ ہیں کہ حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی جائے۔ چنانچہ اسلام کی نگاہ میں یہ بات ہرگز کافی نہیں ہے کہ تم نے خدا کو خدا، اور اس کے قانون کو قانونِ برحق مان لیا۔ نہیں اس کو ماننے کے

اقتدار چھین لو

ساتھ ہی آپ سے آپ یہ فرض تم پر عائد ہو جاتا ہے کہ جہاں بھی تم ہو، جس سرزمین میں تمہاری سکونت ہو وہاں خلقِ خدا کی اصلاح کے لئے اٹھو، حکومت کے غلط اصول کو صحیح اصول سے بدلنے کی کوشش کرو۔ ناخدا ترس اور شتر بے مہار قسم کے لوگوں سے قانون سازی اور فرماں روائی کا اقتدار چھین لو اور بندگانِ خدا کی سربراہ کاری اپنے ہاتھ میں لے کر خدا کے قانون کے مطابق آخرت کی ذمہ داری و جوابدہی کا اور خدا کے عالم الغیب ہونے کا یقین رکھتے ہوئے حکومت کے معاملات انجام دو۔ اسی کوشش اور اسی جدوجہد کا نام جہاد ہے"۔ (ایضاً صہ ۲۳۳)

ہمارے خدا نے ہمیں بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ

تم روئے زمین پر خدا کے سب سے زیادہ صالح بندے ہوئے۔ لہٰذا آگے بڑھو۔ لڑکر خدا کے باغیوں کو حکومت سے بیدخل کر دو اور حکمرانی کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لو
(ایضاً صـ ۲۳۵)

مودودی صاحب ابھی کل تک یہ کہتے چلے آرہے تھے کہ

اپنے منہ میاں مٹھو

اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی جو مختلف جماعتیں اسلام کے نام سے کام کر رہی ہیں اگر فی الواقعہ اسلام کے معیار پر ان کے نظریات، مقاصد اور کارناموں کو پرکھا جائے تو سب کی سب جنس کاسد نکلیں گی۔
(ترجمان القرآن۔ ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ صـ ۸۴)

اور اب انکی جماعت کی طرف سے یہ کہا جا رہا تھا۔

آپ ہمارا ساتھ دیجئے

"میں مسلمانوں کے تمام گروہوں سے کہتا ہوں کہ یہاں شخصیتوں اور گروہوں کا سوال نہیں بلکہ ہم سب خدا کے سامنے جوابدہ ہیں۔ اگر ہمارے ہاتھوں سے یا ہماری نگاہوں کے سامنے یہاں غیر اسلامی نظام قائم ہوگیا تو، ہم سب اسی کی عدالت میں پکڑے جائیں گے۔ اس لئے آپ اپنے سارے اختلافات کو بھول جائیے۔ آپ اگر آرام سے بیٹھے رہے تو یہ کام نہیں ہو سکے گا۔ اس مطالبہ کو منوانے کے لئے تمام ضروری تدابیر اختیار کیجئے اور آپ کو خوب معلوم ہے کہ کسی مطالبہ کو منواتے کے لئے کیا کیا تدابیر اختیار کی جاتی ہیں۔ ابھی ابھی آپ نے پاکستان کا مطالبہ منوا کر جو تجربہ کیا ہے اس سے فائدہ اٹھایئے اور جن صحیح اور موثر تدابیر کو آپ نے اس مطالبہ کو منوانے میں استعمال کیا ہے ان سب کو نظام اسلامی کے مطالبہ کے لئے بھی اختیار کیجئے۔ یہ مطالبہ بھی مخلصانہ کوشش چاہتا ہے، یہ بھی منظم اور متحد طاقت چاہتا ہے اور یہ بھی مال اور وقت اور آرام کی قربانیاں چاہتا ہے۔ اگر ان شرائط کو پورا کر کے آپ یہ ثابت کر دیں کہ یہ قوم کا اجتماعی مطالبہ ہے تو کس طرح ممکن ہے کہ آپ کے لیڈر اس کے خلاف جائیں۔ آپ اس کے لئے جلسے کیجئے اس کے لئے ریزولیوشن پاس کیجئے۔ اس کے لئے پوسٹر آویزاں کیجئے۔ اس کو ریل کے ڈبوں اور موٹر بسوں میں لکھوایئے اسے اپنی خط وکتابت کے کارڈوں اور لفافوں پر طبع کرایئے تاکہ اس مطالبے کے چار نکات آپ کے بچے بچے کی زبان پر ہوں۔
(ترجمان القرآن، جون ۱۹۴۹ء صـ ۲۲)

آپ نے دیکھا کہ پاکستان میں اپنی حکومت قائم کرنے کے لئے عوام کو کس طرح اپنے پیچھے لگانے کی مہم شروع کر دی گئی۔

جمہوری طریقے سے برسراقتدار آنے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ
(۱) اپنی جداگانہ پارٹی بنائی جائے۔
(۲) اور جب یہ دیکھا جائے کہ اس پارٹی کا اثر کافی حد تک بڑھ چکا ہے تو پھر انتخاب لڑا جائے
(۳) اس انتخاب کی رُو سے پارلیمان میں اپنی اکثریت پیدا کی جائے۔
(۴) اس طرح یہ اکثریت اپنی حکومت قائم کرلے۔

اب آپ یہ دیکھئے کہ ان شقوں کے متعلق مودودی صاحب کا پہلے فیصلہ کیا تھا اور اب انہوں نے کسطرح چولا بدلا ہے۔ جب قائداعظمؒ نے ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ کی تنظیم نَو سے اُسے ایک مستحکم جماعت کی شکل دی تو مودودی صاحب نے ارشاد فرمایا کہ اسلام میں الگ جماعتیں بنانا قطعاً جائز نہیں۔ چنانچہ انہوں نے فروری ۱۹۳۸ء کے رسالہ "پیغام حق" میں ایک طویل مقالہ لکھا جس میں انہوں نے کہا کہ

الگ جماعت کی تشکیل غلط ہے

یہ قوم تو پہلے ہی ایک جمعیت ہے۔ اس جمعیت کے اندر کوئی الگ ... جمعیت الگ نام سے بنانا اور مسلمان اور مسلمان کے درمیان کسی وردی یا کسی ظاہری علامت یا کسی خاص نام یا کسی خاص مسلک سے فرق وامتیاز پیدا کرنا اور مسلمانوں کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کرکے ان کے اندر جماعتیں اور فرقوں کی عصبیت پیدا کرنا دراصل مسلمانوں کو مضبوط کرنا نہیں ہے بلکہ ان کو اور کمزور کرنا ہے۔ یہ تنظیم نہیں تفرقہ پردازی اور گروہ بندی ہے۔ لوگوں نے آنکھیں بند کرکے جمعیت سازی کے یہ طریقے اہلِ مغرب سے لئے ہیں۔ مگر ان کو معلوم نہیں کہ جو چیزیں دوسروں کے مزاج کو موافق آتی ہیں وہ مسلمانوں کے مزاج کو موافق نہیں آتیں۔

(پیغامِ حق۔ فروری ۳۸ء صـ۹۳)

اُس وقت وہ اسلام تھا اس کے بعد انہوں نے اپنی پارٹی بنائی اور نہ صرف یہ کہ اس خلافِ اسلام اقدام کے خلاف مودودی صاحب کو کسی قسم کی خفت محسوس نہ ہوئی انہوں نے اس پارٹی کا نام ہی جماعتِ اسلامی رکھا۔ پاکستان آنے کے بعد ابتداء میں انہیں اس کا خیال نہ تھا کہ انہیں پارلیمان میں الگ پارٹی بنانے کی ضرورت ہوگی۔ اس لئے انہوں نے اپنی دستوری تجاویز میں یہ لکھا کہ

اسمبلی میں پارٹی کا قیام ممنوع

مجالسِ قانون ساز میں پارٹیاں بنانا ازروئے دستور ممنوع ہونا چاہیئے۔

(دستوری تجاویز صـ۱۴)

لیکن اب ان کے اسلام نے ان کے کان میں کچھ اور پھونکا ہے جس کی رُو سے

پارلیمانی پارٹی جائز

جماعتِ اسلامی نے قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں اپنی پارلیمانی پارٹی بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ جماعت اسلامی کی مجلسِ شوریٰ کے اجلاس

میں یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والے افراد کو ہر اسمبلی میں پارلیمانی پارٹی قائم کرنے کی ہدایت کی جائے۔

(کوہستان ۱۰ اگست ۶۲ء)

اتنا ہی نہیں بلکہ انہوں نے اگست ۱۹۶۲ء میں راولپنڈی کی پریس کلب میں یہ بھی کہا کہ

تعاون کی پیشکش

جماعت کسی بھی ایسی پارٹی کے ساتھ تعاون کے لئے تیار ہے جو ملک کی خدمت کرنا چاہتی ہے۔ جماعت کو دوسری سیاسی جماعتوں سے کوئی کد نہیں ہے۔ آپ نے مزید کہا کہ پہلے ان جماعتوں کا وجود میں آنا ضروری ہے۔

(نوائے وقت ۲۸ اگست ۱۹۶۲ء)

آپ دیکھئے انتخابات کے متعلق!

یہ آپ اوپر دیکھ چکے ہیں کہ مودودی صاحب نے پہلے یہ بھی کہا تھا کہ اس قسم کے مسلمانوں کی آراء سے کبھی صحیح اسلامی نظام قائم نہیں ہو سکتا۔ پاکستان بننے کے بعد پہلے انتخابات ۱۹۵۰ — ۵۱ء میں منعقد ہوئے۔ اس وقت مودودی صاحب کو معلوم تھا کہ ان کی جماعت کو انتخابات میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی لہٰذا انہوں نے یہ اعلان فرمایا کہ انتخابات میں شرکت ہی سرے سے خلاف اسلام ہے۔ چنانچہ انہوں نے اعلان فرمایا کہ

ناپاک طریقِ انتخاب

اب ہم کو اس امر میں کوئی شک نہیں رہا کہ ہماری اجتماعی زندگی اور قومی سیاست کو جن چیزوں نے سب سے بڑھ کر گندا کیا ہے ان میں سے ایک امیدواری اور پارٹی ٹکٹ کا طریقہ ہے۔ اسی بناء پر جماعت اسلامی نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس ناپاک طریقِ انتخاب کی جڑ کاٹ دی جائے۔ جماعت اسلامی نہ اپنے پارٹی ٹکٹ پر آدمی کھڑے کرے گی نہ اپنے ارکان کو آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہونے کی اجازت دے گی نہ کسی ایسے شخص کی تائید کرے گی جو خود امیدوار ہو۔ اور اپنے لئے ووٹ حاصل کرنے کی کوشش کرے، خواہ انفرادی طور پر یا کسی پارٹی ٹکٹ پر۔ یہی نہیں بلکہ جماعت اپنی انتخابی جدوجہد میں خاص طور پر یہ بات عوام الناس کے ذہن نشین کرے گی کہ امیدوار بن کر اٹھنا اور اپنے حق میں ووٹ مانگنا آدمی کے غیر صالح اور نااہل ہونے کی پہلی اور کھلی ہوئی علامت ہے۔ ایسا آدمی جب کبھی اور جہاں کہیں سامنے آئے لوگوں کو فوراً سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ ایک خطرناک شخص ہے۔ اس کو ووٹ دینا اپنے حق میں کانٹے بونا ہے۔

(بحوالہ جماعت اسلامی کی انتخابی جدوجہد "المنبر" لائل پور، ستمبر ۶۳ء)

اس کے بعد جب انہیں اس کا کچھ یقین ہو گیا کہ ۱۹۵۶ء کے دستور کے تابع ہونے والے انتخابات میں ان کی کامیابی کے امکانات ہیں تو انہوں نے اعلان فرمایا کہ

ناجائز، جائز قرار پا گیا

جماعت اسلامی نے ۱۹۵۰ — ۵۱ء کے انتخابات کے موقع پر ایک پالیسی کا اعلان کیا تھا اور وہ یہ تھی کہ امیدواری چونکہ اسلام میں ناجائز ہے اس لئے ہم نہ خود امیدوار بن کر کھڑے ہوں گے اور نہ کسی امیدوار کو ووٹ دیں گے۔ بعد میں تجربات سے ہم کو معلوم ہوا کہ ہم ابھی اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ ہر ضمنی اور عام انتخابات میں پورے ملک کی ہر نشست کے لئے اپنے معیار مطلوب کے مطابق موزوں امیدوار کھڑے کر سکیں۔ اس بناء پر ہم نے سابقہ پالیسی میں یہ تغیّر کر دیا کہ ہم خود تو امیدوار بن کر کھڑے ہونے سے بدستور مجتنب رہیں گے لیکن فاسد عناصر کے شر کو رفع کرنے اور ان کے مقابلے میں نسبتاً صالح اور اسلامی نظام کے حامی عناصر کو آگے بڑھانے کے لئے جن امیدواروں کی تائید ناگزیر محسوس ہو گی انہیں ووٹ دیں گے بھی اور دلوائیں گے بھی۔"

(ترجمان القرآن بابت مئی ۵۸ء صـ ۱۲۳)

آپ نے غور فرمایا کہ مودودی صاحب کا یہ اعلان اس سے پہلے فیصلے سے یکسر متضاد ہے۔ لیکن یہ صاحب تو "مزاج شناس رسول" ہیں۔ اس لئے انکی کوئی بات بھی دین کے خلاف نہیں ہو سکتی چنانچہ اس نئے اعلان کے ساتھ ہی انہوں نے فرمایا:۔

ہر معقول آدمی بیک نظر محسوس کرے گا کہ ہماری یہ نئی پالیسی ٹھیک ٹھیک دینی نظام کے مطابق ہے اور اس میں دراصل کوئی اصول شکنی نہیں کی گئی۔

(ترجمان القرآن۔ مئی ۱۹۵۸ء)

جی! بالکل نہیں۔ آپ کی ہر بات دینی نظام کے ٹھیک ٹھیک مطابق ہوتی ہے۔ اور آپ کبھی اصول شکنی نہیں کرتے۔

اس کے بعد سوال سامنے آیا کہ کیا آنے والے انتخابات میں جماعتِ اسلامی کسی اور پارٹی کے امیدواروں کی بھی حمایت کریگی۔ کیونکہ ان کا فیصلہ یہ تھا کہ امیدوار کا صالح ہونا ضروری ہے۔ اور صالحین صرف ان کی جماعت کے اندر ہیں۔ لیکن گذشتہ اگست میں جب اُن سے اس کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ جماعت اسلامی ان امیدواروں کی حمایت کرے گی۔ جن کا کردار اور چلن ماضی میں بے داغ رہا ہو۔ اور جو اسلامی نظریہ کے لئے کام کرے۔

(بحوالہ امروز ۲۰ راگست ۶۳ء)

لیکن جب ان سے پوچھا گیا کہ اگر کنونشن مسلم لیگ کا کوئی امیدوار جماعتِ اسلامی کے معیار پر پورا اترتا ہو تو کیا یہ جماعت اس کی حمایت کرے گی تو انہوں نے کہا کہ

کنونشن لیگ کا فرشتہ بھی غلط

" اگر کنونشن مسلم لیگ کسی فرشتے کو بھی امیدوار کھڑا کرے تو جماعت اس کی حمایت نہیں کریگی کیونکہ ہمیں اس کے

اصولوں سے اتفاق نہیں"۔ ایضاً
اور اس کے بالمقابل یہ بھی فرمایا کہ

لیکن ہندو کی حمایت جائز

"اگر ایک ہندو جمہوری نظام کی حمایت کرتا ہے تو اسے میری تائید حاصل ہوگی اس لئے کہ اس نے یہ اصول تو تسلیم کر لیا کہ ملک کا نظام اکثریت کے نظریے کے مطابق ہونا چاہیئے"۔ (ایضاً)

آپ نے غور فرمایا کہ ایک ہی سانس میں دین کے کیسے عظیم نکات بیان کئے گئے ہیں۔ یعنی

(۱) جماعت اسلامی صرف صالح امیدواروں کی حمایت کرے گی۔
(۲) کنونشن مسلم لیگ کا امیدوار کوئی فرشتہ بھی ہوگا تو جماعت اسلامی اس کی مخالفت کریگی کیونکہ وہ تو صالح ہو نہیں سکتا۔ اور
(۳) اگر ایک ہندو جمہوری نظام کی حمایت کرے گا تو جماعت اسلامی اس کی تائید کرے گی اس لئے کہ اس کے صالح ہونے میں شک و شبہ ہی نہیں ہو سکتا۔
(۴) اور اس ہندو کی حمایت اس جمہوری نظام کی تائید کے صلے میں ہوگی جسے مودودی صاحب تشکیل پاکستان سے پہلے نوعِ انسانی کے لئے بدترین لعنت قرار دیا کرتے تھے۔ نیز انہوں نے انتخاب کے سلسلے میں اپنی جماعت کا نصب العین یہ بھی بیان کیا تھا کہ

"وہ گمراہ اور آزمائے ہوئے غلط کار لوگوں کے مقابلے میں ان لوگوں کو انتخاب کے لئے قوم کے سامنے لانا چاہتی ہے جو دیندار بھی ہوں اور دیانت دار بھی اور اس کے ساتھ حکومت چلانے کی اہلیت بھی رکھتے ہوں۔
(منشور جماعت اسلامی ص۱۳)

اب ظاہر ہے کہ اس ہندو سے بڑھ کر دیندار، دیانت دار اور حکومت چلانے کی اہلیت کا مالک اور کون ہو سکتا ہے جو اکثریت کے نظام کے مطالبہ میں مودودی صاحب کا ہمنوا ہو۔

مودودی صاحب اب یہ کہہ رہے ہیں کہ ملک میں جمہوریت کی بحالی اور بالغوں کے لئے حق رائے دہندگی کے لئے ملک گیر مہم چلائی جائے گی۔ اس سے عوام کے ذہن میں یہ تصور جاگزین کرانا مقصود ہے کہ موجودہ دستور کے مطابق نہ تو ملک میں جمہوری نظام قائم ہو سکتا ہے اور نہ ہی بالغوں کو رائے دینے کا حق حاصل ہے۔ یہ دونوں باتیں غلط ہیں اور لوگوں کو فریب دینے کے لئے وضع کی گئی ہیں موجودہ آئین کی رُو سے ہر بالغ کو رائے دینے کا حق حاصل ہے اور مجالس قوانین ساز انتخابات کے ذریعے وجود میں آتی ہیں۔ اسی کو جمہوریت کہا جاتا ہے۔ جمہوری نظام میں اس کی بھی گنجائش ہوتی ہے کہ مجلسِ قانون ساز یا پریذیڈنٹ کا انتخاب براہِ راست ہو اور یہ بھی کہ یہ انتخاب بالواسطہ ہو۔ یہ ہو سکتا ہے کہ آپ ان میں سے کسی ایک طریقے کو زیادہ بہتر خیال کرتے ہوں لیکن اس کے یہ معنی نہیں

کہ اگر آپ کا پسندیدہ طریقہ اختیار نہ کیا جائے۔ تو آپ دوہائی مچا دیں کہ ملک میں جمہوریت نہیں رہی۔
نیز موجودہ جمہوری نظام کی رُو سے پارلیمانی طریق بھی اختیار کیا جا سکتا ہے اور صدارتی نظام بھی۔ یہ ہو سکتا ہے کہ آپ ان میں سے ایک طریق کو بہتر تصور کرتے ہوں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اگر ملک میں دوسرا طریق رائج ہو تو آپ اسے غیر جمہوری قرار دے دیں۔ آپ کو یہ پورا حق حاصل ہے کہ آپ اپنے پسند کے طریق کے حق میں پروپیگنڈہ کریں۔ اور اسے اختیار کرنے کے لئے جدوجہد بھی کریں۔ لیکن دیانت کا تقاضا یہ نہیں کہ آپ یہ کہتے پھریں کہ جس طریق کو میں پسند کرتا ہوں وہ تو جمہوری ہے اور اس کے خلاف دوسرا طریق ڈکٹیٹرشپ ہے۔ مودودی صاحب یہی کچھ کر رہے ہیں۔
واضح رہے کہ جیسا کہ ہم نے شروع میں لکھا ہے کہ اس وقت ہمارے پیشِ نظر یہ بحث نہیں کہ ان طریقوں میں سے کون سا طریق بہتر ہے۔ نہ ہی موجودہ دستور کی وکالت یا مدافعت ہمارا مقصود ہے۔ ہم تو اس وقت صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مودودی صاحب جن باتوں کو اس سے پہلے خلافِ اسلام قرار دیتے تھے وہ اب کس طرح عین مطابق اسلام قرار دی جا رہی ہیں۔ اور جنہیں اس سے پہلے دین کا تقاضا بتایا جاتا تھا اب وہ کس طرح دین کی ضد بتائی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے اہم مسئلہ پریذیڈنٹ کے اختیارات کا ہے۔ موجودہ آئین کی رُو سے پریذیڈنٹ کی پوزیشن یہ ہے کہ اگر وہ پارلیمان سے کسی مسئلہ پر اختلاف کرے تو وہ ویٹو کا حق استعمال نہیں کر سکتا۔ اسے وہ مسئلہ انتخابی ادارہ کے پاس ریفرنڈم کی شکل میں بھیجنا ہوگا۔ اور ریفرنڈم کا فیصلہ حرف آخر سمجھا جائے گا۔ اگر کسی وقت صدر، مجلسِ قانون ساز کو برطرف کرے گا تو اسے خود بھی اپنے عہدہ سے دست کش ہونا پڑے گا۔ یہ ہے صدر کی وہ پوزیشن جسے مودودی صاحب ڈکٹیٹرشپ قرار دے کر اس کے خلاف ملک گیر مہم چلانا چاہتے ہیں۔ لیکن ذرا دیکھئے کہ خود مودودی صاحب کے ارشاد کے مطابق، اسلام کی رو سے صدر مملکت کو کس قسم کے اختیارات حاصل ہونے چاہئیں۔ وہ اپنے پمفلٹ "اسلام کا نظریہ سیاسی" میں لکھتے ہیں کہ

> جب امیر کو چن لیا جائے گا تو اس کو سیاہ و سفید کے اختیارات ہوں گے۔ امیر کو مشورہ کے ساتھ کام کرنا ہوگا۔ عموماً مجلس کے فیصلے کثرت رائے سے ہوں گے۔ مگر اسلام تعداد کی کثرت کو حق کا معیار تسلیم نہیں کرتا۔ اسلام کے نزدیک یہ ممکن ہے کہ ایک اکیلے شخص کی رائے پوری مجلس کے مقابلے میں برحق ہو۔ اور اگر ایسا ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ حق کو اس لئے چھوڑ دیا جائے کہ اس کی تائید میں ایک جم غفیر نہیں ہے۔ لہٰذا امیر کو حق ہے کہ اکثریت کے ساتھ اتفاق کرے یا اقلیت کے ساتھ۔ اور امیر کو یہ بھی حق حاصل ہے کہ پوری مجلس سے اختلاف کر کے اپنی رائے پر فیصلہ کرے۔
> (صہ ۴۵ - ۴۶)

اس سے بھی واضح تر الفاظ میں وہ ترجمان القرآن کی جون ۱۹۴۸ء کی اشاعت میں لکھتے

ہیں کہ

"امیرِ مملکت شوریٰ کی اکثریت کے مقابلے میں ویٹو کا استعمال کر سکے گا (ص ۲۳)

جماعتِ اسلامی نے پاکستان کے آئین کے سلسلے میں جو دستوری خاکہ مرتب کیا تھا اس کی دفعہ ۲۶ میں یہ کہا گیا تھا کہ

ویٹو عینِ اسلام

"امیر کو مجلسِ شوریٰ کی اکثریت کے مقابلہ میں ویٹو کا حق حاصل ہوگا۔

(دو دستوری خاکے۔ ص ۲۸)

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا کہ مودودی صاحب کے نزدیک صدر مملکت کے لئے ویٹو کا حق عین اسلام کے مطابق ہے۔ لیکن یہ کچھ وقت پہلے کا اسلام تھا۔ ان کے موجودہ اسلام کی رُو سے ویٹو کا تصور تک بھی غیر اسلامی ہے۔ ان کے رسالہ ترجمان القرآن کی نومبر ۱۹۶۳ء کی اشاعت میں ایک صاحب کا سوال اور مودودی صاحب کا جواب شائع ہوا ہے۔ اس کا عنوان ہے۔

صدرِ ریاست کو ویٹو کا حق

سوال اور جواب ملاحظہ فرمائیے۔

سوال:۔ کچھ عرصے سے اخبارات کے ذریعہ سے تجاویز پیش کی جا رہی ہیں کہ صدرِ پاکستان کو خلیفتہ المسلمین یا امیرالمؤمنین کے معزز خطاب سے آراستہ کیا جائے۔ اس تصور میں مزید جان ڈالنے کے لئے یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ صدر کو حقِ تنسیخ ملنا چاہیئے۔ کیونکہ حضرت ابوبکرؓ صدیق نے جلیل القدر صحابہؓ کے مقابلے میں ویٹو سے کام لیا اور منکرینِ زکوٰۃ و مدعیان نبوت کی سرکوبی کے لئے جہاد کا حکم دے کر صحابہؓ کی رائے کو رد کر دیا۔ گویا اس دلیل سے شرعی حیثیت کے ساتھ ویٹو جیسے دھاندلی آمیز قانون کو مستحکم فرمایا جا رہا ہے۔

ان حالات کی روشنی میں جناب والا کی خدمت میں چند سوالات پیش کئے جا رہے ہیں۔ امید ہے کہ بہ صراحت جواب سے مطمئن فرمائیں گے۔

(۱) کیا حضرت ابوبکرؓ نے آج کے معنوں میں ویٹو استعمال فرمایا تھا اور

(۲) اگر استعمال فرمایا تھا تو ان کے پاس کوئی شرعی دلیل تھی یا نہیں؟

نئی تاویل

جواب:۔ خلفائے راشدینؓ کی حکومت کے نظام اور آج کل کے صدارتی نظام میں زمین و آسمان کا فرق ہے ان دونوں کو ایک چیز صرف وہی لوگ قرار دے سکتے ہیں جو اسلام کی تاریخ سے بالکل ناواقف ہیں۔ میں نے اس فرق پر مفصل بحث اپنی کتاب اسلامی ریاست صفحہ ۲۰۸ ۔ ۲۰۹ پر کی ہے۔ اُسے ملاحظہ فرما لیں۔ اس سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ جس چیز کو خلافت کے نظام میں "ویٹو" کے اختیارات سے تعبیر کیا جا رہا ہے وہ موجودہ زمانے کے دستوری اصطلاح

سے بالکل مختلف چیز تھی۔ حضرت ابو بکرؓ کے صرف دو فیصلے ہیں جن کو اس معاملہ میں بنائے استدلال بنایا جاتا ہے۔ ایک جیش اسامہؓ کا معاملہ دوسرے مرتدین کے خلاف جہاد کا مسئلہ۔ ان دونوں معاملات میں حضرت ابو بکرؓ نے محض اپنی ذاتی رائے پر فیصلہ نہیں کر دیا تھا۔ بلکہ اپنی رائے کے حق میں کتاب وسنت سے استدلال کیا تھا۔ جیش اسامہ کے معاملہ میں ان کا استدلال یہ تھا کہ جس کام کا فیصلہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عہد میں کر چکے تھے اسے حضورؐ کا خلیفہ ہونے کی حیثیت سے انجام دینا میرا فرض ہے۔ میں اسے بدل دینے کے اختیارات نہیں رکھتا۔ مرتدین کے معاملہ میں ان کا استدلال یہ تھا کہ جو شخص یا گروہ بھی نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرتا ہو اور یہ کہے کہ میں نماز تو پڑھوں گا مگر زکوٰۃ ادا نہیں کروں گا۔ وہ مرتد ہے اسے مسلمان سمجھنا ہی غلط ہے۔ لہٰذا ان لوگوں کی دلیل قابلِ قبول نہیں ہے جو کہتے ہیں کہ لا الہ الا اللہ کے قائلین پر تم کیسے تلوار اٹھاؤ گے۔ یہی دلائل تھے جن کی بناد پر صحابہ کرامؓ نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کے فیصلے کے آگے سر جھکا دیا۔ یہ اگر ویٹو ہے تو کتاب اللہ اور سنتِ رسولؐ کا ویٹو ہے نہ کہ سربراہِ ریاست کا۔

حقیقت میں اسے ویٹو کہنا ہی سرے سے غلط ہے کیونکہ حضرت ابو بکرؓ کے استدلال کو تسلیم کر لینے کے بعد اختلاف کرنے والے صحابہ کرامؓ اس کی صحت کے قائل ہو گئے تھے۔ اور اپنی سابقہ رائے سے انہوں نے رجوع کر لیا تھا۔

(ترجمان القرآن نومبر ۱۹۶۳ء صـ ۶۷)

آپ نے غور فرمایا کہ کل تک جس ویٹو کے حق کو عین مطابق اسلام بتایا جاتا تھا آج اسے کس طرح دھاندلی آمیز قانون قرار دیا جا رہا ہے۔ یوں ان کا اسلام ہر مصلحت کے ساتھ بدلتا رہتا ہے یہی ہے ان کا وہ میکیاولی اسلام جس کے پیشِ نظر صدر مملکت کو اپنی یکم دسمبر ۱۹۶۳ء کی ماہانہ نشری تقریر میں اس تلخ حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کرنا پڑا کہ

"اب ایک، اوروں سے زیادہ مکار شخص، مذہب کا لبادہ اوڑھ کر میدان میں آگیا ہے۔ یہ شخص سیاسی مقاصد کے لئے مذہب کا ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔

(بحوالہ "امروز" ۲ دسمبر ۱۹۶۳ء)

مودودی صاحب کا جواب دعویٰ

ہم یہاں تک لکھ چکے تھے کہ ترجمان القرآن کا دسمبر ۱۹۶۳ء کا شمارہ موصول ہوا۔ اس کے اشارات ان الزامات کے جواب کے لئے وقف کئے گئے ہیں جو مودودی صاحب کے خلاف

آج کل عائد کئے جا رہے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان جوابات کا بھی سرسری جائزہ لے لیا جائے۔ اور جس چالبازی سے لوگوں کو دھوکا دینے کی کوشش کی گئی ہے اس کی بھی نقاب کشائی کر دی جائے۔

ایک نیا فریب آپ کو یاد ہوگا کہ جب وزیر امورِ داخلہ کے بیانات سے ملک کی فضا متاثر ہوئی تو اس کے توڑ کے لئے اس جماعت کی طرف سے کیا حربہ استعمال کیا گیا تھا۔ جماعت اسلامی کے قیم نے یہ بیان دیا تھا کہ

ان بیانات کا مواد ربوہ میں تیار کیا گیا تھا

آپ نے غور فرمایا کہ اس ایک لفظ سے جماعت اسلامی، لوگوں کے ذہن کا رُخ اپنی طرف سے ہٹا کر کس سمت کو پھیرنے کی کوشش میں تھی۔ اس حربے کا اعادہ ان اشارات میں بھی کیا گیا ہے۔ ان میں کہا یہ گیا ہے کہ مودودی صاحب کی جن تحریروں سے ان کے خلاف یہ الزامات عائد کئے جا رہے ہیں۔

"ان کا یہ مطلب اب تک صرف دو گروہوں نے اخذ کیا ہے۔ ایک قادیانی، دوسرے منکرینِ حدیث۔ اس پر "الفضل" اور "طلوعِ اسلام" کے صفحات شاہد ہیں۔ اور ہر شخص جانتا ہے کہ یہ دونوں گروہ مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کی عداوت میں کس قدر اندھے ہو چکے ہیں (ص15)

قرآن کریم نے خناس ذہنیت کی روباہ بازی کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:۔

اَلَّذِیۡ یُوَسۡوِسُ فِیۡ صُدُوۡرِ النَّاسِ (114/5)

یعنی وہ لوگوں کے دلوں میں وسوسے پیدا کرتی ہے اور یہی وہ اس کا شر ہے جس سے پناہ مانگنے کی تاکید قرآن کریم نے کی ہے۔ آپ ان الفاظ پر ایک دفعہ پھر غور کیجئے کہ "ہر شخص جانتا ہے کہ اس عداوت کی اصل وجہ کیا ہے"؟ یعنی یہ خود نہیں بتاتے کہ اس عداوت کی اصل وجہ کیا ہے؟ بس اتنا لکھ کر لوگوں کے دلوں میں ہر قسم کے وسوسے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ "الفضل" کا تو ہمیں علم نہیں، طلوع اسلام نے اس جماعت کی مخالفت کا آغاز 1940ء میں کیا تھا جب یہ بتایا تھا کہ مودودی صاحب قیادت کی ہوس میں، پاکستان کی مخالفت سے مسلمانوں کو کس تباہی کے جہنم کی طرف دھکیل کر لے جانا چاہتے ہیں۔ تشکیل پاکستان کے بعد طلوعِ اسلام نے قوم کو مسلسل آگاہ کیا کہ مودودی صاحب کے عزائم قوم کے لئے کس قدر خطرناک اور تباہ کن ہیں۔ اگر مودودی صاحب میں جرأت ہے تو وہ ذرا مردانہ وار سامنے آئیں اور بتائیں کہ طلوعِ اسلام جو شروع سے ان کی مخالفت کرتا چلا آ رہا ہے تو اس کی اصلی وجہ کیا ہے۔ ضمناً یہ چیز بھی کس قدر مضحکہ خیز ہے کہ طلوع اسلام کو وہ شخص منکرِ حدیث کہہ رہا ہے جسے خود مختلف فرقوں کے علماء نہ صرف منکرِ حدیث بلکہ مرتد اور کافر قرار دے چکے ہیں۔

حکومت پر بزور قبضہ

اشارات میں کہا گیا ہے کہ جو الزامات مودودی صاحب کے خلاف لگائے جا رہے ہیں ان میں سرِفہرست
طاقت کے ذریعہ اقتدار کی تبدیلی۔

کا الزام نظر آئے گا۔ اس کے بعد لکھا ہے۔

وہ شخص جس نے مولانا مودودی کی تحریروں کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہے یا جو ان کے طرزِ فکر سے بالکل سرسری واقفیت بھی رکھتا ہے، وہ جانتا ہے کہ یہ چیز مولانا کے مزاج سے قطعاً کوئی مناسبت نہیں رکھتی۔ انہوں نے سیاسی تبدیلی کے لئے قوت وطاقت کے استعمال کی ہمیشہ مذمت کی ہے۔ (ص۱۱)

ہم پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ کیا مودودی صاحب نے یہ کہا ہے یا نہیں کہ

اب تم روئے زمین پر خدا کے سب سے زیادہ صالح بندے ہو لہٰذا آگے بڑھو اور لڑ کر خدا کے باغیوں کو حکومت سے بے دخل کر دو اور حکمرانی کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لو۔ (خطبات۔ ص۲۳۵)

اور کیا یہ تلقین بھی جماعت اسلامی کے لٹریچر میں موجود ہے یا نہیں؟

جب صالحین کا گروہ منظم ہو۔ اہلِ ملک کی عظیم اکثریت ان کے ساتھ ہو۔ یا کم از کم اس بات کا ظن غالب ہو کہ عملی جدوجہد شروع ہوتے ہی اکثریت ان کا ساتھ دے گی اور کسی بڑی تباہی اور خونریزی کے بغیر مفسدین کے اقتدار کو ہٹا کر صالحین کا اقتدار قائم کیا جا سکے گا۔ اس صورت میں بلاشبہ صالحین کی جماعت کو نہ صرف حق حاصل ہے بلکہ ان کے اوپر یہ شرعی فرض ہے کہ وہ اپنی طاقت منظم کر کے ملک کے اندر بزورِ شمشیر انقلاب پیدا کر دیں۔ اور حکومت پر قبضہ کر لیں۔

(اسلامی ریاست ۔۔۔ ص۴۲)

انوکھی دور اندیشی

اب آگے بڑھئے! ترجمان القرآن کے پیشِ نظر اشارات میں کہا گیا ہے کہ مودودی صاحب بہت بڑے مدبّر، عاقبت اندیش، دور بین اور قوم کے مربّی اور محسن ہیں۔ جب ہندوستان میں مسلم لیگ، پاکستان کے لئے لڑائی لڑ رہی تھی تو اس کے پیشِ نظر دو خطرات تھے۔ ایک یہ کہ اگر مسلم لیگ کو اس جنگ میں شکست ہوگئی اور پاکستان نہ بن سکا تو ہندوستان میں مسلمانوں کو سنبھالنے والا کون ہوگا۔ اور اگر اسے کامیابی ہوگئی تو وہ کون لوگ ہوں گے جو پاکستان میں اسلامی حکومت قائم کر سکیں گے۔ یہ دونوں چیزیں مسلم لیگ کے بس میں نہیں تھیں۔ چنانچہ اس نازک وقت میں اس دُور اندیش مدبّر نے "پانچ چھ سو مخلص کارکنوں کا ایک مختصر سا گروہ اس غرض کے لئے منظم کیا کہ اگر خدانخواستہ اس جنگ میں مسلم لیگ ناکام ہوگئی تو یہ گروہ مسلمانوں کو سنبھالنے کی خدمت انجام دے سکے۔ اور اس گروہ کو جنگ سے الگ رکھا تاکہ اس کے لئے

م کرنا ممکن ہو"۔ اور اس کے بعد ارشاد ہے:۔

کیا اس نے یہ اپنی قوم کے ساتھ کوئی برائی کی تھی۔ یہ دُور اندیشی مذمّت کی مستحق ہے یا اعتراف کی؟ (ص ۱۸)

قی رہا پاکستان میں اسلامی حکومت کا قیام تو اس کے لئے ارشاد ہے کہ

اب اگر اُسی دور اندیش انسان نے یہ وقت آنے سے برسوں پہلے ایک تربیت یافتہ منظم جماعت اس غرض کے لئے تیار کرنی شروع کر دی کہ اسلام سے جب یہ فرار ہونے لگے تو وہ جماعت غلط کار ہاتھوں کو روکنے کے قابل ہو، تو کیا اس نے اپنی قوم اور اپنے دین کے ساتھ یہ کوئی بے وفائی کی تھی؟ (ص ۱۸)

ہی تو ہم کہتے ہیں کہ اس محسن کش، احسان ناشناس قوم پر خدا کا عذاب کیوں نہ طاری ہو جس نے پنے ایسے عظیم محسن کی قدر نا شناسی کی اور نہ تو انہیں ہندوستان میں اپنا قائداعظم بنایا اور نہ یہاں پاکستان کا پریذیڈنٹ۔

اب آتا ہے وہ الزام کہ مودودی صاحب نے قائداعظمؒ اور مسلم لیگ کی مخالفت کی۔ اس کا جو جواب ترجمان القرآن میں دیا گیا ہے اس پر تو آسمان کے فرشتے بھی سر دھنتے ہونگے

خالفت کی مضحکہ خیز وجہ جواز

جو کچھ کہا گیا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ مسلم لیگ اور قائداعظمؒ کی مخالفت مودودی صاحب ہی نے نہیں کی خود علامہ اقبالؒ نے بھی کی۔ آپ حیران ہوں گے کہ وہ کیسے؟ یہ بھی سن لیجئے۔ اس کے لئے انہوں نے ڈاکٹر عاشق حسین ٹالوی کی کتاب "اقبالؒ کے آخری دو سال" کا ایک اقتباس پیش کیا ہے ملاحظہ فرمائیے:۔

تحریک عدم تعاون کے زوال کے بعد جب آل انڈیا مسلم لیگ کی نشاۃ ثانیہ کا دور شروع ہوا اور اس دَور کا پہلا اجلاس مئی ۱۹۲۴ء میں لاہور کے گلوب تھیٹر میں منعقد ہوا تو ڈاکٹر صاحب کے مکان واقع میکلوڈ روڈ اور گلوب تھیٹر کی دیواریں ساتھ ساتھ تھیں۔ لیکن اس قربِ مکانی کے باوجود ڈاکٹر صاحب نے مسلم لیگ کے جلسے میں قدم رکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ دسمبر ۱۹۲۷ء میں جب مسلم لیگ کے دو حصے ہو گئے تو ڈاکٹر صاحب جناحؒ لیگ کے مخالف اور شفیع لیگ کے حامی تھے یہاں تک کہ وہ شفیع لیگ کے سیکرٹری بھی بن گئے تھے۔ ۱۹۲۹ء میں جب مسلم لیگ کا زور توڑنے کے لئے آل انڈیا مسلم کانفرنس معرضِ وجود میں آئی تو ڈاکٹر صاحب اس کانفرنس کے بڑے سرگرم رکن تھے پہلے وہ اس کی مجلسِ عاملہ کے ممبر اور پھر اس کے صدر بن گئے تھے۔

ڈاکٹر سیف الدین کچلو جو راقم التحریر کے دیرینہ کرم فرما اور دوست ہیں ۲۸-۱۹۲۷ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سیکرٹری اور مسٹر جناح کے دستِ راست تھے، انہوں نے ایک مرتبہ ذکر کیا تھا کہ جب دسمبر ۱۹۲۸ء میں کلکتہ کی آل انڈیا کنونشن نے ان تینوں

ترمیموں کو بے دردی سے رد کر دیا جو مسٹر جناح نے پیش کی تھیں تو مسلم لیگ کی حالت سخت نازک ہو گئی۔ مسلمانوں کا سوادِ اعظم مسلم کانفرنس کی قیادت میں آچکا تھا۔ ادھر کانگریس نے یوں ہمارا دستِ تعاون جھٹک دیا۔ ان حالات میں میں ڈاکٹر اقبالؒ کی خدمت میں لاہور حاضر ہوا تاکہ مفاہمت کی کوئی صورت پیدا کی جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے مسٹر جناحؒ کی سخت نکتہ چینی کی اور فرمایا کہ مسلمانوں کی سیاست میں مسٹر جناح نے جو الجھن پیدا کر دی ہے جب تک وہ اس پر ندامت کا اظہار کر کے آئندہ اس سے کلیتہً مجتنب رہنے کا وعدہ نہ کریں مصالحت نہیں ہو سکتی۔ (ترجمان القرآن دسمبر ۱۹۶۳ء صفحہ ۲۰)

یہ رہی علامہ اقبالؒ کی طرف سے مسلم لیگ اور قائدِ اعظمؒ کی مخالفت۔ اب رہے قائدِ اعظمؒ تو ان کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ عمر بھر کانگریسی رہے۔ ہندو مسلم اتحاد کے لئے کوششیں کرتے رہے۔ یہ چیزیں پاکستان کی مخالفت نہیں تھی تو اور کیا تھی؟

مودودی صاحب کا جواب آپ نے ملاحظہ فرما لیا۔ اب ایسے لوگوں سے کیا بعید ہے کہ اگر ان سے کہا جائے کہ تم نے حضور نبی اکرمؐ کی شانِ اقدس میں گستاخی کی ہے تو یہ جواب میں کہہ دیں کہ (معاذ اللہ) حضرت عمرؓ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے لئے تلوار لے کر آگئے تھے میں نے اگر چار باتیں حضورؐ کے خلاف کہہ دیں تو یہ کون سا جرم ہے؟

اعتراض یہ تھا (اور ہے) کہ مودودی صاحب نے مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کی۔ اس مطالبہ کی علمبردار جماعت (مسلم لیگ) کی مخالفت کی۔ اور اس مطالبہ کو پیش کرنے والے (قائدِ اعظمؒ) کی مخالفت کی اور پورا زور لگایا کہ یہ مطالبہ پورا نہ ہونے پائے۔ اور اس اعتراض کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ علامہ اقبالؒ نے بھی نومبر ۱۹۳۴ء میں مسلم لیگ کی مخالفت کی تھی اور محمد علی جناحؒ بھی تو کبھی کانگریس کا بہت بڑا لیڈر رہتا رہا میں نے مسلم لیگ اور قائدِ اعظمؒ کی مخالفت کی تو کون سا انوکھا کام کیا جس کی وجہ سے مجھے موردِ الزام ٹھہرایا جا رہا ہے؟

یہ طبیبِ مشفق؟

اب ان کے جواب کا آخری حصہ ملاحظہ فرمائیے! لکھتے ہیں:۔

مصلحین اور رہنمایانِ قوم کی حیثیت اطباء کی سی ہوتی ہے جس طرح ایک طبیب ایک مریض کے مزاج اور دیگر احوال کو سامنے رکھ کر مختلف اوقات میں اس کے لئے مختلف دوائیں تجویز کرتا ہے بالکل اسی طرح قوم کے خادم بھی اس کے احوال کے مطابق اصلاحِ حال کی کوششوں میں تغیر و تبدل کرتے رہتے ہیں۔ اس تبدیلی کے متعلق آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کی تہ میں مریض کو مار ڈالنے کا جذبہ کام کر رہا تھا۔ اسی طرح ایک ہی مریض کے لئے بسا اوقات دو مختلف طبیب علاج تجویز کرتے ہیں اور مریض بیک وقت ایک ہی طبیب سے علاج کرا سکتا ہے؟ اب اگر ایک طبیب کے علاج سے مریض کو ایک حد تک افاقہ ہو جائے تو کوئی عقلمند یہ نہیں کہہ سکتا کہ دوسرا طبیب

اس مریض کا دشمن تھا اور آئندہ وہ کبھی اس مریض کے قریب نہ پھٹکنے پائے۔ اس طرح کی باتیں یا تو احمق لوگ کیا کرتے ہیں یا پھر وہ پیشہ ور لوگ جو اپنی پریکٹس کی اجارہ داری چاہتے ہوں اور جن کے پیش نظر یہ بات ہو کہ مریض چاہے جیئے یا مرے مگر ان کے مطب سے باہر نہ جانے پائے۔

(ترجمان القرآن دسمبر ۱۹۶۳ء، صہ ۲۷)

اسی دلیل کو ذرا آگے بڑھایئے۔ تقسیم سے پہلے مسلمانوں کے مرض کا علاج تین طبیب کر رہے تھے (۱) نیشنلسٹ مسلمان (۲) قائداعظمؒ اور (۳) مودودی صاحب (اپنے موجودہ دعوے کے مطابق)۔ پہلے دونوں کا بھی یہ دعویٰ تھا کہ وہ مخلص طبیب ہیں اور مریض کی صحت کے متمنی۔ لیکن مودودی صاحب کی کیفیت یہ تھی کہ وہ ان دونوں طبیبوں کو بیچ بازار کھڑے ہو کر گالیاں دیتے تھے اور مریض کو ہر ممکن طریق سے روکتے تھے کہ ان کے مطب میں نہ جانا۔ یہ تمہارے دشمن ہیں۔ سوال یہ ہے کہ (خود مودودی صاحب کی اپنی دلیل کے مطابق) انہیں اس کا کیا حق پہنچتا تھا؟ اور اگر (شفا ہو جانے یا ترجمان القرآن کے الفاظ میں ـــ ایک حد تک افاقہ ہو جانے کے بعد) مریض یہ کہے کہ مجھے تو اسی طبیب پر اعتماد ہے جس کے ہاتھوں میرے مرض میں افاقہ ہوا تو اس کے سر پہ تلوار کیوں نہ رکھ دی جائے کہ نہیں، تمہیں اسی طبیب کی طرف آنا ہوگا جسے خود اعتراف ہے کہ اس کا تجویز کردہ نسخہ صحیح نہیں تھا۔

اور آخر میں ہم اسی دلیل کے منطقی نتیجہ تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ اگر آج پاکستان میں کوئی تحریک یہ دعوے لے کر اٹھے کہ مسلمانوں کی جداگانہ مملکت ایک غلط اقدام تھا۔ ان دونوں ملکوں کو پھر سے ایک ہو جانا چاہیئے اور اس تحریک کا داعی کعبے میں کھڑا ہو کر قرآن سر پہ رکھ کر یہ کہے کہ حاشا و کلّا میرا اس میں کوئی ذاتی مفاد نہیں۔ میں یہ سب کچھ مسلمانوں کی بہتری کے لئے کر رہا ہوں ـــ حتّٰی کہ اگر یہ بھی معلوم ہو جائے کہ اسے اس مقصد کے لئے کسی بیرونی ملک سے امداد مل رہی ہے تو وہ کہے کہ یہ ٹھیک ہے۔ جس چیز کو میں مسلمانوں کی بہتری خیال کرتا ہوں اس کے لئے اگر کہیں سے امداد بھی لے لی جائے تو اس میں کیا حرج ہے ـ تو (ترجمان القرآن کی دلیل کے مطابق) نہ مسلمانانِ پاکستان کو اس کا حق ہونا چاہیئے کہ وہ اس شخص کو ملک کا غدّار قرار دے اور نہ حکومتِ پاکستان کو اس کا کوئی حق کہ وہ ان سرگرمیوں کی روک تھام کے لئے کوئی قدم اٹھائے۔

یہ ہیں مودودی صاحب، اور یہ ہے ان کی سیاست۔ اس سے آپ خود اندازہ لگایئے کہ کیا یہ اسلامی سیاست ہے جس میں ہر فیصلہ ایک اٹل اصول کے تابع ہوتا ہے، یا میکیاؤلی سیاست جس میں مصلحتوں کے ماتحت فیصلے بدلتے رہتے ہیں۔ ہندوستان میں جب مسلمانوں کی اکثریت قائداعظمؒ کے ساتھ تھی تو مودودی صاحب کے اسلام کی رُو سے اکثریت کا فرانہ حکومت قائم کرنے کا ذریعہ تھی

اور اب اسی اکثریت کی رُو سے جو حکومت مودودی صاحب قائم کرنا چاہتے ہیں وہ عین اسلامی ہوگی۔ وہاں جب مسلم لیگ کی تنظیم کی جارہی تھی تو مودودی صاحب کے نزدیک مسلمانوں کی الگ پارٹی بنانا خلافِ اسلام تھا۔ اور اب پارٹیوں کا وجود عین مطابق اسلام ہے۔ جب خود انتخابات میں حصّہ نہیں لینا تھا تو امیدوار کھڑے کرنا خدا اور رسولؐ کے فیصلوں کے خلاف تھا اور اب انتخاب لڑنا منشائے خدا اور رسولؐ کے عین مطابق ہے۔ اُس وقت پارلیمان میں پارٹیاں بنانا ممنوع قرار دیا جاتا تھا۔ اب عین تقاضائے شریعت ہے۔ اُس وقت صدر کے لئے ویٹو کا استعمال مطابق اسلام تھا۔ اب صدارتی نظام بھی غیر اسلامی ہے۔ حتیٰ کہ ان کی شریعت میں جھوٹ بولنا بھی نہ صرف جائز بلکہ واجب ہوجاتا ہے اور رشوت دے کر طلوعِ اسلام کے پرچے چوری سے حاصل کرنا عین خدمتِ اسلام۔

ہم ان سے یہ نہیں کہتے کہ آپ اس قسم کا سیاسی کھیل نہ کھیلیں۔ ہم کہتے صرف یہ ہیں کہ یہ کھیل کھُلے بندوں کھیلیں۔ اسلام کا نقاب اوڑھ کر نہ کھیلیں۔ اور یہی طلوعِ اسلام کی ان سے مخالفت کی وجہ ہے۔

(طلوعِ اسلام بابت جنوری ۱۹۶۴ء)

(بقیہ لمعات صفحہ نمبر (۸) سے آگے

تاجر ہو یا مزدور، غرض ہر ایک اللہ کا خلیفہ ہے جو اس دنیا میں ذمہ داریاں لے کر آیا ہے وہ ذمہ داریاں اس کو پوری کرنی ہیں اگر اسے عاقبت کی بھلائی مطلوب ہے۔

میاں طفیل محمد صاحب نے جس چیز یعنی یہ کہ انسان خدا کا خلیفہ ہے، کو تحریک اسلامی کا پیغام قرار دیا ہے۔ امت مسلمہ کے تمام علماء کے نزدیک ایسا عقیدہ رکھنے والا شخص فاسق و فاجر ہے، اگر میاں صاحب نے قرآن و حدیث کا مطالعہ نہیں کیا تھا تو ایک سیاستدان ہونے کے حوالے سے کم از کم اسلامی سیاست پر مشہور کتاب "الاحکام السلطانیہ" کا ہی مطالعہ کر لیتے تو انہیں معلوم ہوجاتا کہ جس چیز کو وہ جماعت اسلامی کا پیغام قرار دے رہے ہیں۔ وہ علمائے اسلام کے نزدیک فسق و فجور شمار ہوتا ہے۔ امام ابن تیمیہ نے تو اسے خالص شرک قرار دیا ہے۔

(ملاحظہ ہو فتاویٰ کبریٰ جلد دوم صفحہ ۵۵۳)

میاں صاحب کا اگر قرآن و حدیث کا علم اس حد تک ناقص ہے تو کیا ساری جماعت اسلامی میں کوئی ایک بھی اہلِ علم ایسا نہیں تھا جو میاں صاحب کو اس سنگین غلطی پر متنبہ کرتا۔

افکارِ پرویزؒ کی صدی (مسلسل)

خبر (۶)

ہندوستان کا ایک نیشنلسٹ اخبار "حقیقت" لکھتا ہے:۔

ہم سے متعدد قوم پرست مسلمانوں نے شکایت کی ہے کہ گذشتہ سینچر کی شام کو امین الدولہ پارک میں صوبہ کانگریس کے صدر بابو پرشوتم داس ٹنڈن نے گاندھی جی کی سالگرہ کے جلسہ میں جو تقریر کی وہ بے انتہا مسلم آزار تھی۔ ٹنڈن جی نے حسبِ معمول ہندوستان کے مسلمانوں سے اپنا تمدن ترک کر کے ہندوانہ تمدن اختیار کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ اس تقریر کی پوری رپورٹ تو ہمارے پیشِ نظر نہیں۔ ٹنڈن جی جس قسم کی تقریریں مسلمانوں کے خلاف برابر کرتے رہتے ہیں وہ سب کو معلوم ہے۔ آج کل وہ مسلمانوں سے اپنا تمدن ترک کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں تو کل وہ قرآن مجید پڑھنے سے بھی منع کریں گے کیونکہ وہ بھی ایک بدیشی زبان میں ہے۔ قبلہ رو نماز پڑھنے سے بھی روکیں گے کیونکہ مسلمانوں کا قبلہ (مکہ) ایک غیر ملک (عرب) میں ہے اور بالآخر اسلام ترک کر دینے پر بھی اصرار ہوگا کیونکہ پیغمبر اسلام بھی ایک غیر ملک کے رہنے والے تھے۔ صاف ظاہر ہے کہ جس جماعت (کانگریس) کا ایک بہت بڑا ذمہ دار لیڈر مسلمانوں کے خلاف ایسی شدید دشمنی اور عداوت کا اظہار کر رہا ہے اس کی تقریر پڑھنے کے بعد مسلمانوں کو..... اس جماعت کانگریس کی طرف یقیناً رغبت نہیں ہوگی بلکہ اس سے نفرت ہی ہوگی۔ اس لئے خود کانگریس کے مفاد کے لئے بھی اور نیز مسلمانوں کے لئے یہی بہتر ہے کہ وہ ان جلسوں میں جانے سے قطعی پرہیز کریں جن میں ٹنڈن جی تقریر کرنے والے ہوں۔

خبر (۷)

دہلی کے مسلمانوں کے جلسہ کا ایک منظر:۔

دہلی ۲۰ نومبر ۴۸ء بخشی غلام محمد نائب وزیراعظم کشمیر نے آج جامع مسجد میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ محاذِ کشمیر پر ہندو اور سکھ ہی نہیں بلکہ مسلمان بھی لڑ رہے ہیں لیکن اس امر کی شکایت کہ ہندوستان کے مسلمان کشمیر کے معاملہ میں اتنی دلچسپی نہیں لے رہے ہیں جتنی

لینی چاہیئے۔ حاضرین میں سے ایک نیشنلسٹ مسلمان مسٹر عبداللہ فاروقی نے کھڑے ہو کر کہا کہ آپ یہ بتائیں کہ آج جب ہماری پوزیشن یہ ہے کہ ہم قرول باغ اور سبزی منڈی تک میں نہیں جا سکتے تو پورا مشرقی پنجاب پار کر کے آپ کی امداد کے لئے کیسے پہنچیں ..... مسٹر بخشی نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ ایک غیر مذہبی حکومت کے دارالسلطنت میں ہندو و مسلمانوں کے علاقے تقسیم ہیں۔ اور امید ظاہر کی کہ بہت جلد یہ صورتِ حالات ختم ہو جائے گی۔ اس سلسلہ میں آپ نے امداد اور باب حکومت سے بھی گفت و شنید کرنے کا وعدہ کیا۔

خبر:۔ (۸) پنڈت جواہر لال نہرو نے (جامع مسجد) دہلی میں مسلمانوں کو نصیحت کی کہ اگر ان کے ساتھ کسی قسم کی سختی ہوئی ہے تو انہیں اس سختی کو ان لوگوں کا کفارہ سمجھ کر برداشت کر لینا چاہیئے جنہوں نے پاکستان بنوایا۔ آخر تم ہی میں سے وہ لوگ تھے جو "لے کے رہیں گے پاکستان" "بٹ کے رہے گا ہندوستان" کے نعرے لگایا کرتے تھے۔ پنڈت سندر لال کی تقریر کے بعد بخشی غلام محمد نے دوبارہ کھڑے ہو کر پنڈت جی کی اس بات سے اختلاف کیا کہ ہند کے مسلمانوں کے ساتھ اگر کوئی زیادتی ہو تو وہ پاکستان میں غیر مسلموں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا کفارہ سمجھ کر برداشت کر لیں۔ آپ نے کہا کہ پاکستان والے اپنی حکومت کو ہمیشہ سے ایک مذہبی حکومت بتاتے آئے ہیں۔ وہ اگر غیر مسلموں کے ساتھ ناروا سلوک کرتے ہیں تو کریں۔ لیکن جس ہندوستان میں غیر مذہبی اور جمہوری حکومت کا اعلان کیا گیا ہے وہاں غیر مساوی سلوک کو کسی طرح برداشت نہیں کیا جا سکتا اور نہ اسے صحیح اور جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔"

خبر:۔ ۹ انڈین پارلیمنٹ کے اسپیکر مسٹر مولنکر نے کہا ہے:۔ "ہم اس وقت سخت کشمکش میں مبتلا ہیں اگر اس کشمکش کا نتیجہ یہ نکلے کہ کسی ایک فرقہ کی زبان اور تمدن تباہ ہو تو اصول کا تقاضا یہ ہے کہ اقلیت کے فرقہ کی زبان اور تمدن کو تباہ ہونا چاہیئے۔

پھر ارشاد ہے:۔

"رہا مشترکہ زبان کا مسئلہ۔ سو چونکہ اب برطانوی راج ختم ہو گیا ہے اور فرقہ وار سیاست بھی رخصت ہو گئی ہے اس لئے اقلیت کے فرقہ کو اس ضرورت کا احساس کرنا چاہیئے کہ وہ ایک بڑے خاندان کا ممبر ہے اور اسے اس بڑے خاندان میں اپنی ہستی کو ضم کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔"

(بحوالہ الجمعیۃ۔ دہلی)

مارچ ۱۹۴۹ء

مؤتمر عالمِ اسلامی

(ایک جائزہ) ۱۹ فروری ۴۹ء کو مؤتمر عالم اسلامی کی سبجیکٹس کمیٹی کے ایک اجلاس میں مؤتمر عالمِ اسلامی کے اغراض و مقاصد کے سلسلہ میں بتایا گیا کہ یہ مؤتمر کسی ہنگامی تقریب یا وقتی اجتماع کا نام نہیں بلکہ یہ ایک مستقلی ادارہ ہے جو تمام ممالکِ اسلامیہ کے نمائندگان پر مشتمل ہے اس کے سالانہ اجلاس مختلف ممالک میں ہوا کریں گے چنانچہ اسی کا نام ہی "مؤتمر عالم اسلامی" قرار پایا ہے مقصد اس سے یہ ہے کہ ملت کے اجتماعی امور کا حل (جسے احیاء اسلام کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا گیا تھا) تمام دنیا کے مسلمانوں کی باہمی مشاورت سے تلاش کیا جائے اور ایسے اسباب و وسائل اختیار کئے جائیں جن سے یہ مقصد عالیہ سہل الحصول ہو جائے۔ اسی سلسلہ میں تعلیم کا ذکر چھڑ گیا اور اس میں بحث اس موضوع پر آگئی کہ ہمارا موجودہ نظام تعلیم جس میں دینی تعلیم الگ مدارس میں دی جاتی ہے اور دنیاوی تعلیم جداگانہ اسکولوں میں، یکسر غیر اسلامی ہے۔ کیونکہ اس سے دین و دنیا دو الگ الگ شعبے قرار پا جاتے ہیں حالانکہ اسلام میں مذہب و سیاست، دنیا و آخرت، روح اور مادہ میں کوئی تفریق نہیں۔ یہ دونوں ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ چنانچہ فلسطین اور شام کے محترم مندوبین نے بیک آواز کہا کہ اس قسم کی تفریق اسلام سے بدترین عداوت ہے۔

محترم پرویز صاحب جو اس اجتماع میں موجود تھے صدر محفل کی اجازت سے یوں گویا ہوئے:۔

اس موقعہ پر میرے دل میں ایک خلش پیدا ہوتی ہے جسے میں ایک قرآن کے طالب العلم کی حیثیت سے آپ حضرات کے سامنے پیش کر کے اس کے ازالہ کی درخواست کرتا ہوں آپ حضرات نے ابھی ابھی متفقہ طور پر یہ فرمایا ہے کہ اسلام میں دین اور دنیا میں امتیاز کرنا، اسلام سے بدترین عداوت ہے۔ اگر آپ حضرات یہ نہ فرماتے تو بھی اس باب میں ہمارا عقیدہ بالکل ظاہر ہے۔ ہم ساری دنیا کے سامنے اس حقیقت کو ایک مسلمہ کی حیثیت سے پیش کرتے رہتے ہیں کہ اسلام میں مذہب اور سیاست، اور دین و دنیا میں کوئی امتیاز نہیں ہمارے سیاسی دعاوی اسی مسلّمہ پر مبنی ہوتے ہیں۔ ہم حقائق اسلام کو دنیا کے سامنے اسی روشنی میں پیش کرتے ہیں۔ اس کے دلائل میں ہم اکثر و بیشتر یہ حقیقت بھی پیش کرتے ہیں کہ ہماری نماز کو دیکھئے۔ یہ پنج وقتہ اجتماع صرف عبادت ہی نہیں، بلکہ ہمارا محلہ وار معاشرتی اجتماع بھی ہے، یہی دائرہ وسیع ہو کر سارے شہر کو محیط ہو جاتا ہے تو جمعہ کی نماز بن جاتی ہے۔ یہ سلسلہ اور

پھیلتا ہے تو عیدین کی نماز کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے اور اس کے بعد حج کا اجتماع آتا ہے جو درحقیقت مسلمانانِ عالم کی سالانہ کانفرنس ہوتی ہے جس میں عبادت کے ساتھ ساتھ ہمارے تمام بین الملی اجتماعی مسائل کا حل سوچا جاتا ہے۔ ان دلائل کو ہم اپنوں اور بیگانوں، سب کے سامنے پیش کرتے ہیں اور اپنوں سے گلہ کرتے ہیں کہ ہم نے حج کی رسم کو تو قائم کر رکھا ہے لیکن اس کی روح بھلا دی ہے۔ ہماری حیاتِ ملّی کا راز اسی میں ہے کہ ہم ان شعائر میں ان کی اصل روح پیدا کر دیں وقس علیٰ ذالک۔

محترم پرویز صاحب نے اس تمہید کے ساتھ اپنی خلش کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:۔

" ایک طرف حج کا وہ اجتماع ہے جسے ہم "مستقل مؤتمر عالمِ اسلامی" کہتے ہیں اور جس میں دنیائے اسلام کے تمام نمائندے جمع ہوتے ہیں دوسری طرف ہم ایک اور "مستقل مؤتمر عالم اسلامی" قائم کرتے ہیں جو دنیائے اسلام ہی کے نمائندوں پر مشتمل ہے۔ اس مؤتمر کی بنیادی غرض "احیائے اسلام" یعنی ملّت کے اجتماعی مسائل کا حل قرار دیا جاتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ملّت کے اجتماعی مسائل کے حل کے لئے ہمیں اس مؤتمر کے قیام و دوام کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے تو پھر حج کے مؤتمر سے کیا مقصود ہے؟ کیا ہم اس مستقل مؤتمر کے قیام سے خود ہی اس حقیقت کا اعتراف نہیں کر رہے کہ حج کا اجتماع "دین" ہے اور "دنیاوی" مسائل کے حل کے لئے ہمیں ایک اور مؤتمر کی ضرورت ہے! اور کیا یہ اعتراف خود ہمارے ان دعاوی کی کھلی ہوئی تردید نہیں؟ جن کی رُو سے ہم دین اور دنیا کے امتیاز کو اسلام سے بدترین عداوت قرار دیتے ہیں۔ میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے ان دعاوی اور اس عمل میں تطبیق و توفیق کی کیا صورت ہے؟ اگر حج کا اجتماع محض "مذہبی" فریضہ ہے اور اس سے مقصود ہمارے بین الملی مسائل پر غور و فکر نہیں، تو ہمیں اس امر کا اعلان کر دینا چاہیئے اور آئندہ کبھی یہ دعوےٰ نہیں کرنا چاہیئے کہ ہمارے دنیاوی مسائل پر غور و تدبر کیلئے بھی ہمارے دینی اجتماعات مکتفی ہوتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ آج حج ایک مذہبی رسم بن کر رہ گیا ہے اس لئے اس سے یہ مقاصد حاصل نہیں ہو سکتے۔ تو اس کا علاج یہ ہے کہ ہم حج کو از سرِ نو قرآنی خطوط پر متشکل کرنے کی کوشش کریں نہ کہ اسے ایک مذہبی رسم رہنے دیں۔ اور دنیاوی مسائل کے حل کے لئے الگ مؤتمریں قائم کرتے پھریں۔ ہمارا یہ طرزِ عمل دین و دنیا کی اس ثنویت پر مہرِ تصدیق ثبت کر دے گا جسے ہم بلند آہنگی سے خلافِ اسلام قرار دیتے ہیں"

رفتارِ عالم

اس ماہ کے طلوعِ اسلام میں "رفتارِ عالم" کے عنوان سے محترم پرویز صاحب نے لکھا۔

حیدرآباد کو "فتح" کرنے کے بعد اب بھوپال کا کانٹا نکالنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اس ریاست کا حکمران مسلمان ہے جو بہت عرصہ پہلے ہندوستانی یونین میں شرکت کا اعلان

کر چکا ہے اس شرکت کو کافی نہیں سمجھا گیا، اور اس ریاست کے خلاف اس قسم کی تحریک شروع کر دی گئی ہے کہ اسے یونین کے علاقے میں ضم کر دیا جائے تاکہ ہندوستان کی اکھنڈتا میں کوئی خلا نہ رہ سکے۔ حکمران نے اس کا فیصلہ ریاستی باشندوں کی رائے پر چھوڑنے کا اعلان کیا ہے لیکن (بیرونی) ہندوؤں کو یہ وقت طلب جمہوری طریق مطمئن نہیں کر سکتا۔ قرائن سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اس "داغ" سے ہندوستان کے دامن کو بہت جلد پاک کر دیا جائے گا۔

ایک اہم سوال آج سے ۳۶ سال قبل ملت اسلامیہ کی توجہ مبذول کراتے ہوئے ایک اہم سوال کے عنوان سے تحریر فرمایا:۔

بعض حقیقتیں بہت تلخ ہوتی ہیں اور انسانی طبائع ان پر غور و فکر کرنے سے اس لئے گریز کرتی ہیں کہ اس سے جن نتائج تک پہنچا جاتا ہے وہ خوش آئند نہیں ہوتے۔ لیکن کوئی حقیقت محض اس لئے اپنے نتائج نہیں بدل دیا کرتی کہ اس پر غور و فکر نہیں کرنا چاہیئے۔ حقیقت اپنی جگہ پر قائم رہتی ہے اور جب تک آپ اس کا بے نقاب تجزیہ کر کے ان اسباب و علل کا ازالہ نہیں کر سکتے جو اس کا موجب ہیں آپ اس کے نتائج سے بچ نہیں سکتے خواہ آپ کو یہ کتنا ہی ناگوار کیوں نہ گذرے۔

آج ہم ایک ایسی ہی حقیقت کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں جن پر غور و فکر کرنے سے آپ کی طبیعت یقیناً گریز کرے گی۔ اس لئے کہ اس غور و فکر سے آپ لامحالہ جن نتائج پر پہنچیں گے وہ آپ کے لئے خوش آئند نہیں ہوں گے۔ اگر اس پر اس سے پہلے غور کیا جاتا تو ممکن ہے اس وقت حالات ایسے خراب نہ ہوتے اور اگر اس پر اب غور نہ کیا گیا تو حالات یقیناً خراب تر ہوتے جائیں گے۔ یہ سوال بہت اہم ہے اس لئے بڑے گہرے مطالعہ اور تفکر کا محتاج۔

آج دنیا کے اکثر حصوں میں مسلمانوں کی آبادیاں ہیں۔ ان کی مجموعی تعداد کوئی چالیس کروڑ بتاتا ہے کوئی اس سے بھی زیادہ۔ تعداد کچھ بھی ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ پاکستان بلکہ انڈونیشیا سے لے کر مراکش تک، زمین کے مختلف حصوں میں ان کی ایسی آبادیاں ہیں جو دیکھنے والے کو محسوس ہوتی ہیں۔ ان میں یکسر آزاد حکومتیں بھی ہیں اور نیم آزاد بھی۔ محکوم بھی ہیں اور نیم محکوم بھی۔ خالص مسلمانوں کی آبادیاں بھی ہیں اور مخلوط بھی۔ محکوم بھی ہیں یہ سب کچھ ہے لیکن ان کی حالت کیا ہے؟

جو مقابلتہً آزاد مملکتیں ہیں وہ غیر مسلموں کی آزاد مملکتوں کے مقابلہ میں بہت کمزور بلکہ ذلیل ہیں۔ افغانستان۔ ایران۔ حجاز۔ شام۔ مصر وغیرہ حکومتیں یورپ کی غیر مسلم حکومتوں کے مقابلہ میں نہ صرف کمزور ہی ہیں بلکہ ان کا وجود در حقیقت ان کے رحم و کرم پر ہے۔ یورپ کی غیر مسلم حکومتوں کی سیاسی مصلحتیں انہیں جس انداز اور جس حالت میں رکھنا چاہیں، انہیں ویسے ہی رہنا پڑتا ہے،

یہ وہ انگور کی بیلیں ہیں جو اُن شاہِ بلوط کے درختوں کے سہارے کھڑی ہیں۔ ان کی سیاست کی پتلیاں (داخلی اور خارجی ہر دو) ان کے اشاراتِ ابرو پر ناچتی ہیں۔ گذشتہ جنگِ عالمگیر میں ان میں سے ہر مملکت، سہمی اور دبکی ہوئی دن گذار رہی تھی اور اس طرح اقوامِ مغرب کی طاقتوں کے سائے میں پناہیں ڈھونڈ رہی تھیں جس طرح چیل کے سائے سے ڈر کر مرغی کے بچے، مرغی کے نیچے دبک کر بیٹھ جاتے ہیں۔ جنگ کے بعد دنیا کے اہم معاملات کے فیصلے یورپ اور امریکہ کے اکابرِ ثلاثہ (THE BIG THREE) یا ابطالِ خمسہ (THE BIG FIVE) کے مشوروں ہی سے پا رہے تھے۔ جو غیر مسلم اقوام کے نمائندہ ہیں۔ مسلم حکومتوں کو انہوں نے محض آراء شماری کے وقت اپنی تقویت و تائید کے لئے پیچھے پیچھے لگا رکھا ہے۔ اتحادِ اقوامِ اسلامی ——— (PAN 9SLAMISM) کا جو ہوّا ایک عرصہ سے غیر مسلم اقوام کے لئے ذہنی طور پر خوف و رعب بن رہا تھا۔ اس کا بھانڈا فلسطین کے چوراہے پر اس بری طرح پھوٹا ہے کہ ہر نگۂ حساس زمین میں گڑ گئی ہے۔ ادھر انڈونیشیا میں دیکھئے۔ یورپ کے مٹھی بھر گوالے، سات سمندر پار سے آ کر سات کروڑ مسلمانوں کا گلا ایسے آہنی پنجوں سے دبا رہے ہیں کہ ان کی آواز تک نہیں نکلنے پاتی۔ اس سارے خلفشار میں، صرف ترکی ایک ایسا ملک نظر آتا ہے جس نے اقوامِ مغرب کے مقابلہ میں اپنے آپ کو سنبھالے رکھا ہے لیکن اس نے بھی اپنے آپ کو محض سنبھالے ہی رکھا ہے۔ ائمہ اقوامِ عالم میں ان کا بھی شمار نہیں۔ اس وقت قوموں کی امامت، اقوامِ یورپ اور امریکہ ہی کے حصہ میں ہے۔

مخلوط آبادیوں میں مثلاً روس کو لیجئے۔ وہاں مسلمانوں کی خاصی آبادی ہے لیکن وہاں کی حکومت کے کاروبار میں ان کا حصہ کہیں نمایاں نظر نہیں آتا۔ وہ بھی غیر مسلم روسیوں کے رحم و کرم پر ہی زندہ ہیں حتیٰ کہ چین جیسا ملک، جو ممالکِ عالم میں نہایت پست درجہ شمار ہوتا ہے، وہاں بھی یہ حالت ہے کہ کبھی مسلمانوں کا نام ابھر کر سامنے نہیں آتا۔ یورپ کے کئی ایک حصوں میں مسلمان (مخلوط طور پر) آباد ہیں۔ لیکن ننگ و نازِ حیات میں ان کے چرچے کبھی سنائی نہیں دیتے۔

اب اپنے گھر میں آئیے۔ کل تک مسلمان اور ہندو، ہندوستان میں انگریزوں کے محکوم تھے لیکن مسلمان، انگریز کا بھی محکوم تھا اور ہندو کا بھی۔ زندگی کے ہر شعبہ میں، ہم اپنے آپ کو ہندوؤں سے بہت پیچھے پاتے تھے۔ آج بھی وہاں قریب چار کروڑ مسلمان بستے ہیں۔ ان پر جو کچھ گذر رہی ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔ مملکتِ پاکستان بالکل نوزائیدہ ہے اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ اس کے متعلق ابھی کوئی حتمی رائے قائم کرنا قبل از وقت ہے۔ لیکن ہماری انفرادی اور قومی خصائص و اوصاف تو ہمارے سامنے ہیں۔ ان کی روشنی میں ہم اپنے متعلق کچھ نہ کچھ رائے تو قائم کر ہی سکتے ہیں۔ اور وہ رائے کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔

یہ ہیں وہ واقعات جن میں سے کسی ایک کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان پر ایک مرتبہ پھر

نگاہ ڈال لیجئے کہ کہیں کوئی غلطی تو نہیں ہوگئی!

اب آگے بڑھیے! مسلمانوں کی یہ آبادیاں دنیا کے مختلف حصّوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ایک دوسرے سے ان کے جغرافیائی حالات مختلف ہیں۔ آب وہوا مختلف ہے، طرزِ بود وباش مختلف ہے۔ زبانیں مختلف ہیں۔ طبائع مختلف ہیں۔ ان میں قدرِ مشترک ہے تو صرف ایک۔ یعنی ان کا مذہب

اب آپ یہ سوچیئے کہ اگر ایک غیر مسلم مبصر، حالات کے اس تجزیہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ اقوامِ عالم کے مقابلہ میں مسلمانوں کی پستی اور ذلّت کا باعث ان کا مذہب ہے، تو آپ کے پاس اس کا کیا جواب ہے؟

اس میں ناک بھوں چڑھانے کی کوئی بات نہیں۔ لاحول پڑھنے کا کوئی مقام نہیں۔ اگر آپ کو یہ تسلیم ہے کہ واقعات وہی ہیں جو اوپر لکھے گئے ہیں اور حالات ایسے ہی ہیں جن کا ذکر کیا گیا ہے، تو اس غیر مسلم کے اس سوال کا جواب ہمارے ذمّے ہے۔ اس طبقہ کی طرف سے، جس نے ایک مدّت سے حقائق سے چشم پوشی اختیار کر رکھی ہے۔ اس سوال کا (بزعم خویش) بڑا آسان جواب یہ دیا جائے گا کہ مسلمانوں نے چونکہ مذہب کو چھوڑ رکھا ہے اس لئے یہ اس درجہ ذلیل وخوار ہو رہے ہیں لیکن یہ جواب خود انہیں تو مطمئن کر سکتا ہے، حقائق کو بے نقاب دیکھنے والوں کو مطمئن نہیں کر سکتا۔ وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر انہوں نے مذہب کو چھوڑ دیا ہے تو غیر مسلم اقوامِ مغرب نے مذہب کو کون سا پلّے باندھ رکھا ہے انہوں نے ان سے پہلے اور ان سے کہیں شدید تر انداز سے مذہب کو چھوڑا ہے۔ لہٰذا اس صورت میں دونوں یکساں ہو گئے۔ پھر وہ کون سی بات ہے جس کی وجہ سے غیر مسلم اقوام اس قدر طاقتور ہیں اور مسلم اقوام دنیا کے ہر گوشے میں کمزور اور ذلیل ہیں۔ پھر یہ بھی کہ بالآخر ایسے مسلمان بھی تو ہیں جنہوں نے مذہب کو نہیں چھوڑا۔ ان کی حالت کونسی اچھی ہے!

یہ سوالات ایسے ہیں جو تاریخ وسیاست کے ہر طالب علم کے سامنے آتے ہیں۔ آپ ان سے گھبرائیے نہیں۔ ان پر غور وفکر کیجئے۔ جب تک آپ ان پر آزادانہ غور نہیں کریں گے، حقیقتِ حال تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ اور جب تک آپ اصل حقیقت تک نہیں پہنچیں گے۔ اپنی موجودہ حالت میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکیں گے۔

باب المراسلات

(ترکہ اور وصیت) ترکہ اور وصیت کے سلسلہ میں ایک صاحب نے محترم پرویز صاحب سے دریافت کیا:۔

"آپ نے کئی مرتبہ لکھا ہے کہ قرآن کریم کے احکام، ہمارے وقتی مصالح اور مقتضیات کی رعائت رکھتے ہوئے ہمیں اجازت دیتے ہیں کہ ہم اپنے حالات کے مطابق فیصلے کر لیں۔ لیکن اس باب میں ایک اہم سوال سامنے آتا ہے جس کا جواب میری سمجھ میں نہیں آتا۔ قرآن کریم انسان کو اس کی ملکیت کی چیزوں پر تصرف کا حق دیتا ہے، لیکن اس کی تقسیم کے لئے اس کے مقتضیات کی کوئی رعایت نہیں رکھتا بلکہ تقسیم وراثت کے ایسے حصّے مقرر کرتا ہے جس میں تغیر وتبدّل کا اسے کوئی

اختیار نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر لیجیئے۔ ایک شخص نے اپنے بڑے بیٹے کو لکھایا پڑھایا ولائت تک پاس کرایا۔ اب وہ نہایت معقول ملازمت میں ہے۔ ہزاروں روپے کی آمدنی رکھتا ہے۔ خود صاحب جائیداد بھی ہے۔ اس شخص کا دوسرا لڑکا ابھی ایک سال کا بھی نہیں ہوا کہ اس کی موت کا وقت قریب آجاتا ہے۔ حالات کا تقاضا ہے کہ اس ننھے سے یتیم کی کفالت کے لئے ترکہ الگ کر دیا جائے۔ لیکن اسے اس پر کچھ اختیار نہیں۔ قرآن کی رُو سے بڑا بیٹا برابر کا حصّہ لے جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ اسی قسم کی مجبوریاں تھیں جن کی وجہ سے پنجاب کی زراعت پیشہ اقوام نے زمین میں سے لڑکیوں کو حصّہ دینا بند کر دیا تھا۔ ایک شخص کی تھوڑی سی اراضی ہے اس کی لڑکی پچاس میل کے فاصلہ پر کسی گاؤں میں بیاہی ہوئی ہے۔ اس شخص کے ورثہ میں سے اس لڑکی کا حصّہ نکالئے تو چپہ بھر زمین نہ لڑکی کے کسی کام کی، نہ اس کے بیٹے کی۔ اسی طرح کی اور مثالیں ہیں۔ کیا آپ تحریر فرمائیں گے کہ ان امور میں ذاتی مصالح اور مقتضیات کا لحاظ کیسے رکھا جائے گا؟

محترم پرویز صاحب نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا:۔

آپ نے جن دقتوں کا ذکر فرمایا ہے وہ وراثت کے اس قانون کی پیدا کردہ ہیں جو ہمارے ہاں صدیوں سے مروج چلا آرہا ہے لیکن جو بدقسمتی سے یکسر قرآن کے خلاف ہے۔ یہ مشکلات اس بناء پر پیش آتی ہیں کہ ہم نے یہ سمجھ رکھا ہے (اور یہی ہمارے ہاں کا مروجہ قانون وراثت ہے) کہ کسی شخص کو اپنے مال اور جائیداد میں وصیّت کا حق نہیں۔ قرآن نے جو حصّے مقرر کر رکھے ہیں اس کا ترکہ بالکل انہی حصّوں کے مطابق تقسیم ہوگا۔ یہ غلط ہے اور قرآن کی تعلیم کے صریحًا خلاف۔

قرآن نہ صرف وصیّت کی اجازت ہی دیتا ہے بلکہ اسے فرض قرار دیتا ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے

كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۨ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ؁ ۲/۱۸۰۔ مسلمانوں یہ بات تم پر فرض کر دی گئی ہے کہ جب تم میں سے کوئی آدمی محسوس کرے کہ اس کے مرنے کی گھڑی آگئی ہے اور وہ اپنے مال و متاع میں سے کچھ چھوڑ جانے والا ہے تو وہ اپنے ماں باپ اور رشتہ داروں کے لئے وصیّت کر جائے۔ جو متقی انسان ہیں ان کے لئے ایسا کرنا ضروری ہے۔

اس آیۂ مبارکہ پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ کیا اس سے زیادہ واضح اور صریح حکم اور بھی کوئی ہو سکتا تھا۔ آیت کی ابتداء اس سے ہوتی ہے کہ تم پر وصیّت فرض قرار دی گئی ہے اور انتہا اس پر کہ جو متقی انسان ہیں ان کے لئے ایسا کرنا ضروری ہے۔ پھر سورۂ مائدہ (آیات ۱۰۶–۱۰۷) میں یہ تاکید آئی ہے کہ اس وصیّت کے لئے گواہ بھی مقرر کئے جائیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب انسان کو اس کے ترکہ کی تقسیم کے لئے وصیّت کی اجازت (بلکہ تاکید) ہے تو پھر قرآن کریم نے تقسیم وراثت کے حصّے کس لئے مقرر کئے ہیں! اس سوال کا جواب خود قرآن کریم میں ہے اور ان آیات کے اندر جن میں وراثت کے حصّے متعیّن کئے گئے ہیں۔

احکامِ وراثت سورۂ نساء کے شروع میں آئے ہیں آیت نمبر ۱۰ لغایت نمبر ۱۲ کو دیکھئے پہلے اولاد، والدین اور بہن بھائیوں کے حصوں کا ذکر ہے اور اس کے بعد فرمایا ہے مِنۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَا أَوْ دَيْنٍ (۴/۱۱) یہ حصے اس وصیّت کے بعد تقسیم ہونگے جو میّت نے کی ہو یا جو کچھ اس نے قرض چھوڑا ہو اس کی ادائیگی کے بعد اس کے بعد پھر اور رشتہ داروں کے حصوں کا ذکر ہے اور اس کے بعد پھر ارشاد ہے کہ یہ تقسیم، وصیّت کی تعمیل اور قرضہ کی ادائیگی کے بعد ہوگی" پھر تیسری مرتبہ بھی یہی ارشاد ہے۔ اس کے بعد باقیماندہ حصوں کا تذکرہ ہے اور اس کے چوتھی مرتبہ پھر وہی ارشاد ہے کہ یہ تقسیم میّت کی وصیّت اور قرضہ کی ادائیگی کے بعد ہوگی۔ اور اس کے بعد فرمایا کہ وَصِيَّةً مِّنَ اللَّهِ (۴/۱۲) یہ اللہ کی طرف سے حکم ہے۔ ان الفاظ پہ احکامِ وراثت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

اب آپ سوچ لیجئے کہ بات کس قدر واضح ہے یعنی ہر مسلمان پر وصیّت فرض کی گئی ہے۔ اسے اپنی جائیداد واموال کی تقسیم میں پورا پورا اختیار ہے کہ اپنے مصالح ومقتضیات کے مطابق جسے چاہے اور جتنا جی چاہے، دیدے۔ لیکن اگر ایسا اتفاق ہو جائے کہ کسی وجہ سے انسان وصیّت نہ کرسکا ہو یا اس کا ترکہ وصیّت سے بڑھ جائے، تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ نے اس کے ورثے کی تقسیم، اس کے وارثوں پر نہیں چھوڑ دی بلکہ اس کے حصّے خود مقرر کر دیئے ہیں۔ یہ ہیں وہ حصے جو غیر متبدل ہیں .....

یہ ہیں وصیّت (اور تقسیم ترکہ) کے بارے میں قرآن کے احکام۔ غور کیجئے کہ کس قدر واضح اور غیر مبہم ہیں یہ احکام۔ لیکن اس کے باوجود مقامِ صد حیرت ہے کہ مسلمانوں کا "مسلمہ" قانونِ وراثت کس قدر قرآن کے خلاف ہے۔ اور یہ حیرت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ قانونِ وراثت ہم میں صدیوں سے چلا آرہا ہے۔ اس پہ سوائے اس کے کہ انسان اپنا سر پکڑ کر بیٹھ جائے اور کیا کرے! اس قانون میں یا تو سرے سے وصیّت کی اجازت ہی نہیں۔ اور اگر اجازت ہے تو صرف تہائی مال میں۔ اور وہ بھی وارثین کے لئے نہیں۔ اور یا للعجب! کہ اس قانون کو منسوب کیا جاتا ہے اس ذات گرامیؐ کی طرف جس کی حیات طیبہ کا ایک ایک سانس قرآن کی اتباع میں گزرا۔ اور یہ صرف اس لئے کہ ہمارے مجموعہ روایات میں کس طرح دو چار روائتیں اس قسم کی شامل ہوگئیں۔ اب رواۃ پرستی کا تقاضا تھا کہ ان روایات کو صحیح سمجھا جائے خواہ اس سے قرآن کریم کے صریح احکام کی مخالفت ہی کیوں نہ ہوتی ہو اور خواہ اس سے حضورؐ صاحب قرآن (علیہ التحیۃ والسلام) کی ذاتِ اقدس پر بھی طعن کیوں نہ آئے! آپ اس کا خیال بھی کر سکتے ہیں کہ قرآن کریم وصیّت کو فرض قرار دے اور بلا مشروط یعنی پورے مال میں وصیّت کا حق دے (اور اس کی تاکید کرے) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرمائیں کہ نہیں! وصیّت صرف ایک تہائی مال میں ہوسکتی ہے اور وہ بھی غیر وارثین کے لئے۔

خدا کے حکم میں ایسا ردّو بدل، یقیناً رسول اللہ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی شانِ اقدس کے سخت خلاف ہے۔ لیکن با ایں ہمہ۔ ہمارے ہاں یہ قانون موجود ہے اور صدیوں سے اس پر امّت کا عمل ہوتا چلا آرہا ہے۔

کمیونزم کا خطرہ

ماہنامہ طلوع اسلام کی مارچ ۱۹۴۹ء کی اشاعت میں "حقائق وعبر" کے عنوان سے محترم پرویز صاحب نے گورنر جنرل صاحب کے ایک بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

۱۲ فروری کو گورنر جنرل صاحب نے مشرقی بنگال میں ممکن کمیونسٹ خطرہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:-

> مجھے اس سے اتفاق نہیں کہ کمیونزم مشرقی بنگال میں گھر کر رہا ہے۔ البتہ یہ صوبہ میں سرگرم ضرور ہے۔ کمیونسٹ چاولوں کی گرانی کو اپنے پروپیگنڈے کا بہانہ بنا رہے ہیں.... چونکہ اب مشرقی بنگال میں لگاتار چاول پہنچ رہے ہیں اس لئے اس پروپیگنڈہ کا نمایاں اثر نہیں ہوگا۔

ہم نے سابقہ اشاعت میں اشارہ کیا تھا کہ مشرقی بنگال میں کمیونزم کی تقلید کی جا رہی ہے اور غلط مفروضوں سے جی بہلایا جا رہا ہے۔ گورنر جنرل کے اس بیان نے ہماری رائے کو اور پختہ کر دیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ کمیونسٹ چاولوں کی گرانی کو بطور حربہ استعمال کر رہے ہیں۔ لیکن یہ صحیح نہیں کہ چاول کے نرخ بحال ہو گئے تو کمیونسٹ خود بخود ختم ہو جائیں گے۔ یہ حقیقت ہے کہ پاکستانی عوام میں ہمہ گیر بے چینی اور بد اطمینانی پھیلی ہے۔ عوام حکومت اور اربابِ حکومت سے مطمئن نہیں۔ پنجاب اور سندھ میں نام نہاد جمہوری نمائندوں نے جو مذموم مظاہرے کئے ان سے عوام اور بردا شتہ خاطر ہو گئے ہیں۔ نظام حکومت عمومی اعتبار سے چند افراد کے فائدے کے لئے چلایا جا رہا ہے۔ کم از کم ڈیڑھ سال کے تجربہ کے بعد عوام یہی سمجھنے لگ گئے ہیں۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ موجودہ صورتِ حالات ان کی حقیقی آزادی کی دلیل نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اب ان کی جنگِ آزادی کا نیا دور شروع ہوا ہے۔ وہ کل تک غیر کے غلام تھے اب اپنوں کے ہیں۔ اگر بفرضِ استدلال یہ کہا جائے کہ یہ ان کی غلط بینی یا غلط فہمی ہے تو اس کا کیا علاج ہے کہ وہ ایسا سمجھتے ہیں۔ جب تک عوام کی یہ بد اعتمادی اور دل برداشتگی کسی نہ کسی رنگ میں باقی ہے کمیونسٹ خطرہ دور نہیں ہو سکتا۔ چاول کی قیمت اعتدال پر آجائیگی تو بیسیوں اور مصیبتیں سامنے آجائیں گی، جو کمیونسٹوں کے لئے راہیں کشادہ کر دیں گی۔ کمیونزم آہستہ آہستہ کئی ممالک کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے۔ اب اس سیلاب کا رخ ایشیائی ممالک کی سمت ہے۔ ایشیا کے سیاسی و اقتصادی کوائف کمیونزم کو دعوت دے رہے ہیں۔ ہندوستان اس کی لپیٹ میں آچکا ہے۔ پاکستان ایک گونہ محفوظ ہے۔ یاد رکھیئے ایک گونہ! اگر حکومت نے اس خطرہ کا کما حقہٗ احساس نہ کیا اور نظم و نسقِ حکومت کو بلند انسانی اقدار کے مطابق نہ چلایا

تو چاول مہنگے ہوتے تو کیا اور سستے ہوتے تو کیا، وہ اس سیلاب بلا کو نہیں روک سکے گی۔ چاول کی قیمت علامت مرض ہے علت مرض نہیں کمیونزم کہیں اپنے پاؤں نہیں جما سکتا جب تک اس کے لئے فضا نہ تیار ہو جائے اور جہاں اس کیلئے فضا تیار کر دی جاتی ہے پھر اسے کوئی طاقت روک نہیں سکتی آپ کو معلوم ہے آندھی کس طرح آتی ہے۔ زمین کے کسی ایک خطہ میں شدت حرارت سے ہوا ہلکی ہو کر خلا پیدا کر دیتی ہے اس خلا کو پُر کرنے کے لئے دوسری جگہ کی ہوا جھکڑ بن کر آ جاتی ہے۔ سو آندھی آ نہیں سکتی جب تک خلا نہ پیدا ہو جائے اور جب خلاء ہو تو پھر آندھی کو کوئی قوت نہیں روک سکتی کمیونزم کی آندھی بھی اسی طرح آیا کرتی ہے۔ ہم روز اوّل سے اس جگر خراش حقیقت کو دہرا رہے ہیں کہ پاکستان میں حکومت اور عوام کے درمیان ایک خلا پیدا ہو چکا ہے۔ اس خلا کو پُر کرنے کی کوشش کیجئے ورنہ بد نہاد قوتیں اس سے ناجائز فائدہ اٹھا جائیں گی۔ لیکن اس وقت تک اس کی طرف کسی نے کوئی توجہ نہیں دی۔ یاد رکھیئے، ان طوفانوں کا علاج لیپا پوتی سے نہیں ہو سکے گا۔ جب تک حقائق کا بے نقاب مقابلہ نہیں کیا جائیگا ان کا ازالہ نہیں ہو سکے گا۔ یہ سمجھ لینا کہ کمیونسٹ چاولوں کی گرانی کا بہانہ بنا رہے ہیں اور اس کے بعد یہ کہہ کر مطمئن ہو جانا کہ چونکہ اب وہاں چاول پہنچ رہے ہیں۔ اس لئے یہ خطرہ ہو ہوم ہو گیا ہے۔ سکون فریب ہے۔ جب تک عوام کو عملاً محسوس نہیں کرایا جاتا کہ پاکستان ان کی خوشحالی کا ضامن ہے اس وقت تک ان خطرات کا ہر وقت اندیشہ ہے۔ یہی اس کا علاج ہے اس کے سوا سب فریب نفس ہے یاد رکھیئے۔

تدبّر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا

جہاں میں جس تمدّن کی بنا سرمایہ داری ہے

اپریل ۱۹۴۹ء رفتارِ عالم کے عنوان سے پاکستان میں پائے جانیوالی بے چینی کا تجزیہ کرتے ہوئے محترم پرویز صاحب نے لکھا۔ پاکستان کو ابھی تک کمیونسٹ یلغار کا سامنا نہیں کرنا پڑا لیکن شمارہ گذشتہ میں پاکستان کی بالعموم اور مشرقی پاکستان کی بالخصوص جو حالت بتائی گئی تھی وہ ابھی تک اصلاح پذیر نہیں ہو سکی مشرقی پاکستان کی ریلوں میں شدید بے چینی پائی جاتی ہے جس سے تجارت اور خوراک اور کپڑے کی نقل و حرکت پر بُرا اثر پڑا ہے گندم، چاول اور نمک کی قیمتیں بدستور چڑھ رہی ہیں ڈھاکہ یونیورسٹی کے ادنیٰ درجہ کے ملازمین ہڑتال کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں جس سے یونیورسٹی غیر معینہ عرصہ کے لیئے بند کر دی گئی ہے اس اندرونی بے چینی اور اضطراب میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کا علاج صرف قرآنی نظام معاشی ہی کر سکے گا۔ جسے بہت جلد نافذ کر دینا چاہیئے۔

مغضوب اسرائیلیوں کی ریاست یہودی ایک مغضوب علیہ قوم ہے اس کا تجزیہ کرتے ہوئے محترم پرویز صاحب نے لکھا:-

یہ سوال کہ یہودیوں پہ ذلت و محکومی کا عذاب مشروط بہ شرائط و خصائص ہے۔ یا ان کے کسی جرم عظیم کی بناء پر یہ سزا قیامت تک کے لیئے ان پر مستولی رہے گی۔ نظری حیثیت سے اکثر ذہنوں میں گردش کرتا رہا ہے۔ لیکن فلسطین میں اسرائیلی ریاست کی تشکیل سے یہ سوال عملی طور پر سامنے آگیا ہے اور اس نے ان لوگوں کو جو سمجھتے تھے کہ "از روئے قرآن" یہودی کبھی اپنی حکومت قائم نہیں کرسکتے۔ اس صورت حال نے بڑے ضغطہ میں ڈال دیا ہے جس سے ان کا ذہن عجیب کشمکش میں مبتلا ہو رہا ہے چنانچہ اس ارتیاب و اضطراب کا مظاہرہ وہ استفسارات ہیں جو ہم سے اس باب میں کیے جا رہے ہیں

یہودی بربنائے نسل ایک قوم ہیں اور بربنائے عقیدہ ایک مذہب کے پیرو۔ ان کے ہاں مذہب، ایک قوم کی چار دیواری میں محدود رہا ہے۔ لہٰذا مذہبی اور نسلی دونوں اعتبارات سے یہودیوں کی قومی وحدت کی تشکیل ہوئی ہے۔ مذہب تو چونکہ پھر بھی ایک ایسی چیز ہے جسے اپنی مرضی سے مانا اور چھوڑا جا سکتا ہے اس لئے صرف مذہب کی بناء پر قومیت کے دائرہ سے انسان باہر بھی آ سکتا ہے۔ لیکن نسلی اعتبار سے قومیت کے دائرے سے باہر نکلنا کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ نہ کوئی غیر نسل کا انسان اس قوم میں داخل ہو سکتا ہے نہ اس نسل کا کوئی انسان اس قوم سے باہر نکل سکتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا قرآن کے قانون مکافات کی رو سے ایسا تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ کسی قوم کی کوئی ایک نسل (GENERATION) کوئی جرم کرے اور اس کی پاداش میں اس قوم کے قیامت تک کی آنے والی نسلیں سزا میں ماخوذ رکھی جائیں؟ اگر ایسا تسلیم کیا جائے تو یہ عیسائیت کے اسی عقیدہ کے مماثل ہو گا جس کی رو سے وہ تمام بنی آدم کو آدمؑ کے گناہ کی پاداش میں پیدائشی گنہگار تصور کرتے ہیں۔ یہ عقیدہ قرآن کے یکسر خلاف ہے۔ وہ جب باپ کے گناہ کے عوض بیٹے کو نہیں پکڑتا، تو ایک نسل کے جرائم کی سزا میں آنے والی نسلوں کو کس طرح ماخوذ کر لے گا؟ وہ اقوام عالم کے متعلق یہ عالمگیر اصول بیان کرتا ہے کہ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ۔ ان کے نیک و بد اعمال کے نتائج انہی تک محدود ہوتے ہیں۔ اگر کسی جرائم پیشہ گروہ کی آئندہ نسل شریف بن جاتے تو . . ان کے اسلاف کے جرائم ان پر کسی طرح بھی اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ اس اصول کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ کسی ایک دور کے یہودی اپنے اسلاف کے گناہوں کی سزا میں ماخوذ نہیں کیے جا سکتے۔ وہ اگر اسی قسم کی عقوبت میں مبتلا ہیں تو اس کے ذمہ دار ان کے اپنے جرائم ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہے کہ اگر کسی ایک دور کے یہودی، ان کے جرائم سے مجتنب ہو جائیں جن کی سزا میں ان کے اسلاف ماخوذ تھے، تو ان سے یہ سزا ٹل جائے گی اور یہ اپنے عمدہ

اعمال کے ثمرات سے بہرہ ور ہوں گے۔ کہ خدا کسی کے اچھے کاموں کا اجر ضائع نہیں کرتا ......

ان مقدمات کی روشنی میں یہ ظاہر ہے کہ یہودیوں کے دورِ تنزل کے افراد جن جرائم کے مرتکب ہوتے ان کے اثرات اسی صورت میں آگے منتقل ہوں گے جب ان کی آنے والی نسلیں بھی انہی جرائم میں مبتلا رہیں۔ جب ان کی کوئی نسل ان جرائم سے مجتنب ہو کر اپنی اصلاح احوال کر لے گی۔ اس سزا سے محفوظ ہو جائے گی اگر قانون خداوندی کی رُو سے یہود کا نحن ابناء اللہ (خدا کی چہیتی اولاد ہونے) کا دعویٰ اس بناء پر باطل تھا کہ خدا کا قرب نسل سے مشروط نہیں بلکہ اعمال سے مشروط ہے، تو یہود یہ غضب الٰہی بھی ان کے یہودی النسل افراد، چاہے کتنے ہی اچھے کیوں نہ ہو جائیں، وہ معتوب و مغضوب ہی رہیں گے۔ خدا کے قانونِ مکافات کے خلاف ہے۔ یا یہ سمجھنا کہ یہودی النسل افراد کے لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ اچھے کام کر سکیں، فطرتِ انسانی کے صحیح مطالعہ کے خلاف ہے لہٰذا یہ سمجھنا بھی غلط ہے کہ یہودی کچھ ہی کیوں نہ کر لیں، وہ قیامت تک ذلیل و خوار رہیں گے۔

قرآن میں ان کی ذلت و خواری کو ان کے اعمال کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے اگر وہ اعمال بدل جائیں گے تو ان کا نتیجہ بھی بدل جائے گا

وراثت ارضی کا ابدی قانون

اپریل ۱۹۴۹ء کے شمارہ میں محترم پرویز صاحب کا مضمون "وراثت ارض کا ابدی قانون" کے عنوان سے رونق اوراق بنا ہے۔ جس میں موصوف نے استخلاف فی الارض کے بنیادی اصولوں کو قرآن کریم کی روشنی میں پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

انسان کی ہیئت اجتماعیہ میں سب سے اہم شعبہ نظامِ حکومت اور آئینِ مملکت ہے جسے قرآن "وراثت ارض" کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ حکومت کسے ملتی ہے اور کس طرح ملتی ہے؟ اور پھر کس سے چھنتی ہے اور کیوں چھنتی ہے؟ اس کے لئے بھی خدا کا ایک ابدی قانون معین ہے اور وہ قانون، قرآن کے الفاظ میں مشہود ہے جو سورۂ انبیاء میں یوں مرقوم ہے:۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ۝
اِنَّ فِي هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ ؕ (۲۱/۱۰۵ - ۱۰۶)۔

ترجمہ:۔ اور ہم نے تورات کے بعد، زبور میں (بھی) اس حقیقت کو لکھ دیا تھا کہ زمین کی وراثت ہمارے "صالح" بندوں کے لئے مقدر ہے (اس عظیم الشان قانونِ خداوندی میں) عبودیت اختیار کرنے والی قوم کے لئے ایک عظیم القدر بصیرت افروز حقیقت کشا پیغام ہے۔

امانت حکومت و مملکت کی تفویض اور متاعِ جہانداری و جہانبانی کی وراثت کے متعلق یہ وہ قانونِ ابدی اور اصول سرمدی ہے، جس کا "نوشتہ خداوندی" کی حیثیت سے اعلان کیا گیا ہے اور اس میں قوموں کے عروج و زوال اور امتوں کے استخلاف و استبدال کے متعلق ایک ایسے بنیادی معیار کا ذکر کیا گیا

ہے جس میں ہر صاحبِ بصیرت کے لئے پیغامِ عظیم اور بلاغِ مبین مضمر ہے۔ یہ بنیادی اصول کیا ہیں؟ بس یہی کہ وراثتِ ارض کے لئے صلاحیت (یا صالحیت) شرط ہے یعنی وہی قانون جو عالمِ آفاق میں بقاء للاصلح کے محکم اصول کی حیثیت سے جاری و ساری ہے ......

زمین کی وراثت (حکومت و مملکت) کے مستحق وہی ہوں گے جو اس کی صلاحیت و قابلیت رکھتے ہوں جن میں زندگی اور اس کی توانائیاں تڑپ رہی ہوں۔ جن کے سینوں میں دم، جگر میں خون، بازوؤں میں قوت، پاؤں میں استقامت، ذہنوں میں جلا، نگاہوں میں روشنی، ارادوں میں بلندی اور عزائم میں پختگی ہو۔ جو دنیا میں حکومت و سطوت کی زندگی بسر کرنے کی تمنا رکھتے ہوں اور پھر اس تمنا کی تکمیل اور اس آرزو کے حصول کے لئے ایسی قوت فراہم کریں کہ جو قوم انکے عزائم کی راہ میں مزاحم ہو اسے خس و خاشاک کی طرح بہالے جائیں۔ دنیا میں جس کے پاس قوت نہیں اسکا کوئی دعویٰ بھی سچا نہیں جو اپنی قوتِ بازو سے زندہ رہنے کا حق قائم نہیں کرتا اسے کوئی زندہ رہنے نہیں دیتا۔

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

مئی 1949ء ماہ مئی کا طلوع اسلام علامہ اقبالؒ پر مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس ماہ کے لمعات میں تحریر ہے۔

طلوع اسلام، حکیم الامت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کی یاد میں شائع ہو رہا ہے اس کا مقصد ان کے پیامِ حیات آور کی نشر و اشاعت ہے۔ اسی لئے اس کا ہر نمبر اقبال نمبر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے آج تک کوئی الگ اقبال نمبر شائع نہیں کیا۔ بایں ہمہ اقبال سے متعلق کچھ مضامین ایسے تھے جنہیں قارئین طلوع اسلام تک پہنچانا ضروری تھا۔ اس لئے مناسب سمجھا گیا کہ اشاعتِ زیرِ نظر میں انہیں یکجا شائع کر دیا جائے۔ اور چونکہ یہ پرچہ اپریل سے متعلق ہے جو حضرت علامہ کی وفات کا مہینہ ہے (کہ ان کی وفات ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو ہوئی تھی) اس اعتبار سے اس اشاعت کو اشاعتِ خصوصی بہ یادِ اقبال کہا جا سکتا ہے۔

طلوع اسلام اشخاص پرستی کو مٹانے اور حقائق پرستی (کہ جو درحقیقت خدا پرستی کا دوسرا نام ہے کیونکہ حقیقت وہی ہے جو خدا کی طرف سے ملتی ہے) کو عام کرنے کے لئے مشہود ہوا ہے۔ اس لئے جب یہ اپنے آپ کو اقبال سے منسوب کرتا ہے تو اس سے مراد "ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال، ایم، اے، پی، ایچ، ڈی، بار ایٹ لا" نہیں جو سیالکوٹ میں پیدا اور لاہور میں دفن ہوئے۔ بلکہ اس سے مقصود اقبال کا وہ پیغام ہے جس نے اس مُردوں کی بستی میں صورِ اسرافیل پھونک دیا اور راہ گم کردہ کاروانِ ملت کو از سر نو نشانِ منزل سے آگاہ کر دیا۔

پھر اس پیغام سے بھی ہمیں صرف اس لئے دلچسپی ہے کہ یہ درحقیقت قرآن کا پیغام

ہے جسے اقبال نے اپنے الفاظ میں پیش کیا ہے۔ اس لئے پیغام اقبال کی نشر و اشاعت سے مقصود صرف یہ ہے کہ اس طرح مسلمانوں کو قرآن سے قریب تر لایا جائے اور انہیں اس چشمۂ حیات سے از سرِ نو متعارف کرایا جائے جس میں حقیقی زندگی کا راز مستور ہے۔ لہٰذا اقبال ہمارے نزدیک مقصود بالذات نہیں بلکہ ایک عظیم مقصد تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔

جون ۱۹۴۹ء اس ماہ کے شمارہ میں "رام داس" کے عنوان سے سود اور منافع کی اصطلاحات کے استعمال کی مثال پیش کرتے ہوئے لکھا ہے۔ رام داس ہندو تھا اور ہندو ہی رہا۔ لیکن بعض مصلحتوں کی بناء پر اس نے اپنا نام عبداللہ رکھ لیا۔ سب جاننے والے اس کی اس حرکت کا مذاق اڑاتے اور اس سے کہتے کہ فقط نام کی تبدیلی سے "رام داس" عبداللہ کیسے بن سکتا ہے اور اس کا یہ فریب کب تک نبھ سکتا ہے۔ معلوم نہیں اس تبدیلیٔ نام سے رام داس نے اپنے آپ کو فریب دیا تھا یا دوسروں کو فریب دینے کی کوشش کی تھی۔ لیکن بات کچھ بھی ہو، تھی مبنی بر حماقت۔

لیکن اس قسم کی حرکت کسی "رام داس" ہی پر موقوف نہیں۔ بڑے سے بڑے "عالی دماغ" مدبر بھی یہی کچھ کر رہے ہیں۔

برطانوی عہد حکومت میں، گورنمنٹ ہند کی طرف سے قرضوں اور بچت کی اسکیموں وغیرہ کے اعلانات شائع ہوتے تھے تو ان پر صاف طور پر لکھا ہوتا تھا کہ اس روپے پر اتنے فی صدی سود ملے گا۔ پاکستان "اسلامی حکومت" کی طرف سے سود کا اعلان شدید گناہ تھا اس لئے کہ ربوٰا کو قرآن نے بہ نص صریح حرام قرار دے رکھا ہے چنانچہ اس حکومت کی طرف سے "پاکستان سیونگ سرٹیفکیٹ" خریدنے کے متعلق جو اعلانات شائع ہو رہے ہیں ان میں لکھا ہوتا ہے کہ ہر دس روپے بارہ سال کے بعد پندرہ روپے بن جائیں گے گویا ½ ۴ فیصدی سالانہ منافع ہوگا۔

اس طرح حاصل کئے ہوئے منافع پر انکم ٹیکس ادا نہیں کرنا پڑتا۔

دیکھا آپ نے کہ "اسلامی حکومت" کی برکت سے کس طرح "رام داس"، عبداللہ میں تبدیل ہوگیا۔ جس اضافے کا نام کفار کی حکومت میں سود تھا اس کا اسلامی حکومت میں منافع ہو جاتا ہے اور اس تبدیلیٔ نام سے اطمینان حاصل کر لیا جاتا ہے کہ حرام، حلال میں تبدیل ہوگیا۔

ہم اس وقت اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتے کہ ڈاکخانے اور بینک میں جمع کردہ روپے پر جو اضافہ ملتا ہے وہ حرام ہے یا حلال۔ کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ اسلامی حکومت کا کام یہ تھا کہ اس سوال کو قرآن کریم کی روشنی میں حل کرتی اور اس کے بعد اگر وہ اس نتیجہ پر پہنچتی

کہ یہ اضافہ، ربوا میں داخل نہیں تو پوری جرأت سے اس کا اعلان کرتی۔ محض نام کی تبدیلی کو ماہیت کی تبدیلی سمجھ لینا ایک ایسی خوش فہمی ہے جسے خود فریبی یا ابلہ فریبی سے زیادہ کچھ نہیں سمجھا جا سکتا۔ یہودیوں کے متعلق قرآن میں ہے کہ وہ لفظوں کو توڑتے مروڑتے رہتے تھے یہ بھی اس قسم کی ذہنیت کا مظاہرہ ہے اس فریب نفس کو دور کرنے کیلئے قرآن نے فرمایا تھا (آیت نہیں لکھی گئی)

یہ فقط نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباء نے رکھ چھوڑے ہیں ان کیلئے اللہ کی طرف سے کوئی سند نازل نہیں ہوئی۔

خدا کرے ہمارے اربابِ حل و عقد الفاظ کی خود فریبی سے نکل کر حقائق کا براہِ راست سامنا کرنے کی کوشش کریں

مادر پدر آزادی

نوجوانوں کا ایک طبقہ آزادی کے مفہوم کا جس طرح غلط فائدہ اٹھا رہا ہے اس پر تنقید کرتے ہوئے محترم پرویز صاحب نے لکھا ہے

جب کسی قوم کو تطہیرِ فکر، پختگیٔ عقائد اور بلندیٔ سیرت کے بعد آزادی ملے، یعنی ان کی آزادی ان کی قلبی اور ذہنی صلاحیتوں کا فطری نتیجہ ہو، تو وہ قوم اس حقیقت کو علیٰ وجہ البصیرت دیکھتی اور اپنے ضمیر کی انتہائی گہرائیوں میں محسوس کرتی ہے کہ صحیح آزادی نام ہے قوانین وضوابط کی پابندی کا وہ سمجھتی ہے کہ صحیح اختیار ہمیشہ جبر سے حاصل ہوتا ہے۔ وہ جانتی ہے کہ جب تک پانی کی طغیانیاں ساحل کی بندشوں میں محصور رہیں، اس کا نام ندی ہے اور اس کا وجود باعث فلاح وبہبود، لیکن جونہی وہ ساحل کی قیود کو توڑ کر بے زمام ہو جاتے، ندی، سیلاب بن جاتی ہے اور اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

پاکستان میں نوجوانوں کا ایک طبقہ ایسا ہے جس نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ آزادی سے مفہوم ہر قسم کے اخلاقی ضوابط سے سرکشی اور مستقل اقدارِ انسانیت سے بغاوت "دورِ جہالت" میں اگر کوئی فرد کسی اخلاقی قدر کی خلاف ورزی کرتا تھا تو وہ اپنے دل میں محجوب اور معاشرہ کی نگاہ میں معتوب ہوتا تھا لیکن اس "دورِ تہذیب"، کے یہ نوجوان اپنی اس سرکشی اور بے باکی میں فخر محسوس کرتے ہیں اور اگر ان سے کسی اخلاقی پابندی کا تقاضا کیا جاتا ہے تو شور مچا دیتے ہیں کہ یہ آئینِ آزادی کے خلاف ہے فحاشی اور عریانی کے ان علمبرداروں نے اپنا نام رکھ چھوڑا ہے "ترقی پسند مصنفین" اور اپنی اس آوارگیٔ فکر ونظر کو کہتے ہیں "ادب لطیف"، چونکہ یہ "ادب" ذہنی تعیش اور خیالی معصیت کوشی کے لذائذ وحظائظ کا سامان بہم پہنچاتا ہے اس لئے (ظاہر ہے) کہ بازاری طبقہ میں اس کی مانگ بہت ہوتی ہے اسے یہ طبقہ اپنی مقبولیت پر محمول کرتا ہے۔ اس مقبولیت میں مزید اضافہ کے لئے انہوں نے "مزدوروں کی حمایت" اور "سرمایہ داری کی مخالفت"، وغیرہ قسم کے چند عنوانات تجویز کر رکھے ہیں۔ جن کے تحت یہ انقلاب کے دعویدار بن کر سامنے آتے ہیں۔ حالانکہ ان کا یہ انقلاب، اخلاقی ضوابط کو الٹ دینے کی کوشش کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔

یہ مرض اس قدر متعدی ہوتا چلا جا رہا ہے کہ اگر اس کی روک تھام کے لئے مؤثر

اقدام نہ کیا گیا تو ڈر ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد ہماری پوری کی پوری نئی پود بداخلاقی کے جرائیم کا پیکر مدقوق و مسلول بن کر رہ جائے گی۔

ہمارے اس خود فریب نوجوان طبقہ کو کون بتائے کہ

آزادیٔ افکار سے ہے ان کی تباہی — رکھتے نہیں جو فکر و تدبّر کا سلیقہ

ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار — انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

لمعات

اس ماہ کے لمعات میں "بلیک مارکیٹ" کی وبا کی طرف توجہ دلاتے ہوئے محترم پرویز صاحب نے لکھا "گذشتہ عالمگیر جنگ نے ہندوستان (اور اس کے سابقہ پاکستان) کو جن نئی نئی اصطلاحات سے نوازا ہے ان میں سب سے نمایاں حیثیت "بلیک مارکیٹ" کو حاصل ہے اس کی ابتدا تو اس سے شروع ہوئی کہ بیع و شریٰ کے مسلمہ آئین وضوابط کو پس پشت ڈال کر، غیر آئینی طریق سے جو نفع حاصل کیا جائے۔ اُسے "بلیک مارکیٹ" کہا جاتا ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ مسلک، خرید و فروخت کی تنگنا سے نکل کر زندگی کے ہر شعبے کو محیط ہو گیا۔ جنگ ختم ہو گئی لیکن اس سانپ کی لکیریں، ہمارے معاشرہ کا مستقبل جزو بن چکی ہیں ...... ہماری سوسائٹی کی عام حالت یہ ہو چکی ہے کہ ہر جگہ "بلیک مارکیٹ" کا دور دورہ ہے۔ کیا تجارت اور کیا صنعت و حرفت۔ کیا لین دین اور کیا کاروبار۔ کیا کارخانے اور کیا دفاتر۔ کیا گھر اور کیا اس کے باہر۔ کیا ملت اور اس کے لیڈر۔ ہر طبقہ دوسرے کی جیب کاٹنے کی فکر میں سرگرداں دکھائی دے گا۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ کسی ایک کو دوسرے پر اعتماد نہیں۔ کسی کو کسی کی بات کا یقین نہیں۔ کہاں وہ کیفیت کہ کسی سے ایک بات طے ہو گئی تو اس کے بعد چین کی نیند سو گئے۔ اور کہاں اب یہ حالات کہ اوّل تو ۹۹ فیصدی ایسے جنہیں بات کا پاس نہیں اور اگر کہیں کسی ایک نے اسے پورا بھی کر دیا تو دل میں یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ نہ جانے اس میں بھی کیا راز ہے؟ نتیجہ یہ کہ عدم اطمینان اور فقدان اعتماد کی آگ ہے جو دلوں کی بستیوں کو اندر ہی اندر راکھ کا ڈھیر بنائے جا رہی ہے۔ نہ میاں کو بیوی پر اعتماد نہ باپ کو بیٹے پر۔ دوست کو دوست پر بھروسہ ہے نہ مالک کو نوکر پر۔ نہ گاہک کو دکاندار کی بات کا اعتبار ہے نہ دکاندار کو گاہک کے قول کا یقین۔ نہ حکومت رعایا سے مطمئن ہے۔ نہ رعایا حکومت سے خوش۔ سوسائٹی نہیں۔ جنگل ہے جس میں وحشت و بربریت کا دور دورہ ہے۔ انسانوں کی بستی نہیں، درندوں کا بھٹ ہے جس میں ہر گرگ کو ہے برہ معصوم کی تلاش"

مستقل اقدار انسانیت کو نظامِ کہن کی بوسیدہ یادگاریں کہہ کر ٹھکرایا جا رہا ہے اور اخلاقی ضوابط کو عہد جہالت کے مٹتے والے نقوش قرار دیکر۔ ان کی ہنسی اڑائی جاتی ہے "نظامِ کہن" کے آئین اس طرح ختم ہو چکے ہیں اور ان کی جگہ کوئی نیا نظام قائم نہیں ہوا۔

(اس کا باقی حصہ صفحہ ۳۵ پر ملاحظہ فرمائیں)

عورت کی حفاظت

آج کل ہمارے ہاں "چادر اور چار دیواری" کی جدید اصطلاح ہر خاص و عام کی زبان پر سنائی دیتی ہے اور اس کی تشریح و توضیح میں اخبارات و رسائل وغیرہ میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور لکھا جا رہا ہے مگر اتفاق رائے نہ ہونے کی وجہ سے اس مسئلہ کا کوئی ایک متوازن و منضبط حل سامنے نہیں آیا۔ محض الفاظ کا ہیر پھیر جاری ہے اور بات بنتی نہیں۔ بات تو اسی وقت بن سکتی ہے جب ہم اپنی سوچ اور فہم کو اپنے خالقِ حقیقی اللہ تبارک وتعالیٰ کے عطا کردہ معیار کے مطابق رکھیں۔ کیونکہ اگر ہم مسلمان ہیں تو ہمیں اس کا مکلف ٹھہرایا گیا ہے کہ ہم اپنی زندگی کے معاملات کے فیصلے اور مسائل کے حل اپنی عقل و فکر کو وحیٔ خداوندی کے تابع رکھ کر قرآنِ حکیم کے دائمی اصولوں کی روشنی میں تلاش کریں۔ چنانچہ مسئلہ زیرِ بحث کے حل کے لئے بھی ہمیں لازماً قرآن کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ قرآنِ کریم نے انسانی جان اور مملکت کو جتنا اہم قرار دیا ہے۔ اسی قدر عورت کی حفاظت کو لازم ٹھہرایا ہے۔ اس مکمل ترین ضابطۂ حیات کے نزدیک جس معاشرہ میں کوئی عورت اپنے آپ کو محفوظ و مامون تصور نہ کرے اور اسے سماجی و اخلاقی لحاظ سے تحفظِ ذات وعصمت حاصل نہ ہو۔ اس معاشرہ کا توازن قائم نہیں رہ سکتا۔ وہ معاشرہ بگاڑ و فساد کی کھلی تصویر بن جاتا ہے۔ برعکس اس کے جو قرآنی معاشرہ محسنِ انسانیت سرورِ دوعالم نبی اکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک ہاتھوں متشکل ہوا۔ حضورؐ نے اس کا منتہیٰ یہ فرمایا تھا کہ اس میں ایک عورت یمن سے تن تنہا شام تک سفر کرے گی اور اسے کسی قسم کا خوف و خطرہ نہ ہوگا۔ اس حدیثِ مبارکہ سے یہ روشن حقیقت سامنے آتی ہے کہ حسنِ معاشرہ کی پہچان ہی یہ ہے کہ اس میں عورت گھر کے اندر ہو یا گھر سے باہر وہ کسی جگہ کسی وقت بھی اپنے آپ کو غیر محفوظ نہ پائے۔ اگر ہم غور و فکر سے کام لیں تو اس فرمانِ نبویؐ میں "چادر اور چار دیواری" کے مسئلے کا واضح حل موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ بات تو ساری تحفظِ عصمت کی ہے جسے ہم نے چادر اور چار دیواری سے وابستہ کر دیا ہے۔ یہ حدیثِ قدسی بتا رہی ہے کہ عورت پر یونہی گھر کے اندر محبوس رہنے یا رکھے جانے کی کوئی پابندی نہیں۔ وہ چاہے تو گھر سے باہر میدانوں میں اور صحراؤں میں سفر کر سکتی ہے اور تنہا بھی کر سکتی ہے۔ ہاں مگر اس کے بے خوف و خطر جانے کی ذمہ داری مردوں پر عائد ہوتی ہے۔ انہیں اپنی سوچ اپنے جذبات و

خیالات کو قوانینِ خداوندی کی چار دیواری کے اندر رکھنا ہوگا۔ انہیں اپنی سوچ اپنے جذبات و خیالات کو قوانینِ خداوندی کی چار دیواری کے اندر رکھنا ہوگا۔ انہیں چادرِ عصمت اوڑھنا ہوگی۔ پھر عورت کو اپنے تحفظ کی طرف سے کوئی خطرہ نہ ہوگا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اگر معاشرے کے مرد پاکباز اور باعصمت ہو جائیں تو عورتوں کی عفت وعصمت خود بخود محفوظ ہو جائیگی۔ اس اہم قرآنی نکتے کی طرف تو عام طور پر کسی مرد کا دھیان نہیں جاتا یا وہ جانے نہیں دیتا۔ بجائے اس کے چادر اور چار دیواری کی اصطلاح رائج کر کے یہ تاثر دیا جا رہا ہے کہ عورتوں کو گھروں کے اندر رہنے کا پابند بنایا جائے تاکہ ان کی حفاظت ہو سکے۔ یعنی مردوں کا مؤقف یہ ہے کہ اگر عورتیں گھروں سے باہر نکلیں گی تو پھر ان کا اللہ ہی حافظ ہے۔ اس بارے میں ان کی کوئی ذمہ داری نہیں۔ اب یہ دیکھئے کہ ایک طرف ہمیں قرآن وسنت پر ایمان رکھنے کا دعویٰ ہے اور ہمارے سامنے قرآنِ حکیم کی ایک مستقل قدر عصمت کے متعلق واضح ہدایت ہے جس کی جامع تفسیر حضورؐ کی درخشندہ و پائندہ حدیثِ مذکورہ کر رہی ہے کہ تحفظِ عصمت کے لئے مردوں کی کیا ذمہ داری ہے اور دوسری طرف اسی کے تعلق سے ہماری یہ خود ساختہ روش اور یہ ہمارے من مانے فیصلے! ببیں تفاوت راہ از کجا تا بہ کجا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آج ہمارے ہاں صورتِ حال یہ ہے کہ بعض اوقات عورتوں یا بچیوں کو گھروں سے باہر کام کرتے ہوئے یا سیر وسیاحت کے دوران تحفظ خویش (جس میں جان وآن دونوں شامل ہوتی ہیں) کے حوالے سے خوف وخطرات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ لیکن یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کیا یہ مرد حضرات اس سے بری الذمہ ہو سکتے ہیں؟ کیا ان کے لئے ضروری نہیں کہ وہ قرآن کے اپنے متعلق احکام پر توجہ دیں اور فرمانِ رسولؐ کی پیروی کو اپنی سیرت کا حصہ بنائیں: حقیقت یہ ہے کہ اگر مرد اس مستقل قدر (تحفظِ عصمت) کے حوالے سے اپنی ذمہ داری کو سمجھ لیں تو کوئی وجہ نہیں کہ مومن بھائیوں کی مومن بہنیں (یہ قرآنِ کریم کی دوسری عظیم قدر ہے اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ) معاشی ومعاشرتی تقاضوں کے تحت بلا خوف وخطر گھروں سے باہر نہ نکل سکیں۔ اور انہیں تحفظ میسر نہ آ سکے۔ چادر اور چار دیواری کے تعلق سے یہ سمجھ لینا کہ عورت گھر کی چار دیواری میں بند رکھنے کی کوئی مادی بے جان شئے ہے۔ انسان نہیں کہ جسے اللہ تعالیٰ نے ارادہ واختیار کی آزادی کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ یہ مرد ہی کا طرۂ امتیاز ہو سکتا ہے۔ بریں عقل و دانش بباید گریست۔

فہم وشعور رکھنے والا ہر فرد جانتا ہے کہ خداوندکریم کی عظیم تخلیق انسان مرد عورت دونوں پر مشتمل ہے اور جس طرح مرد انسان، حقِ آزادی رکھتا ہے۔ اسی طرح عورت انسان کے حقِ آزادی کو دبا کی کوئی طاقت نہیں چھین سکتی کہ انسان کا یہ حق، حق تعالیٰ کا عطا کردہ ہے۔ پھر یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ کہ خود انسان اپنے جیسے دوسرے انسان کا یہ حق چھین لینا چاہے محض اس لئے کہ وہ جسمانی طور پر اپنے آپ کو زیادہ طاقتور سمجھتا ہے۔ اور اس حیوانی طاقت کی بنا پر عورت پر من مانی قدغن لگا دے اور اسے بے بس ومجبور کر دے۔ گھروں میں بند رکھنا تو وہ سزا ہے جو قرآن نے ان عورتوں کیلئے

مقرر کی ہے جو بے حیائی کی حرکات کی مرتکب ہوتی ہیں۔ جس کا ذکر سورۃ النساء کی پندرہویں آیت میں کیا گیا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تمام عورتوں کو گھروں میں محبوس کر دیا جائے یا ان کے باہر نکلنے پر بے جا پابندیاں لگا دی جائیں۔ اس "بڑے خطرے" کے پیشِ نظر کہ عورتوں کی موجودگی سے مرد اپنے اوپر کنٹرول نہیں رکھ سکتے۔ ان کا ایمان ڈگمگانے لگتا ہے اس لئے "نہ رہے بانس نہ بجے بانسری" والا معاملہ ہونا چاہیئے۔ کیا ایمان کی یہی شان ہوتی ہے؟ کیا مضبوطیٔ کردار اور پاکیزگیٔ سیرت اسی کا نام ہے؟ چادر اور چار دیواری سے مفہوم اگر پردہ ہے تو اس قسم کا پردہ جس میں عورتوں کو گھروں کے اندر بند رکھا جاتا ہے نہ صرف منشائے قرآنی کے خلاف ہے بلکہ جرم ہے۔ کیونکہ کسی بے گناہ کا حبسِ بے جا عرفاً اور شرعاً جرم ہے۔ یہاں قبل اس کے کہ پردہ کے متعلق قرآنی تعلیم سے رہنمائی لی جائے۔ ہمارے لئے یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ زمانۂ نزولِ قرآن میں رسول اکرمؐ کی اولین مخاطب قوم کا تمدن کیا تھا اور ان کی معاشرت کس سطح پر تھی۔ قرآنِ کریم سے یہ نشاندہی ہوتی ہے کہ وہ اجڈ اور جاہل و سرکش قوم تھی جسے تہذیب و شائستگی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ انہیں آدابِ معاشرت کی چھوٹی چھوٹی باتوں تک سمجھانے کی ضرورت تھی چنانچہ وحی کے ذریعے یہ احکام بھی نازل ہوئے کہ چیخ چیخ کر باتیں نہ کرو۔ اکڑ اکڑ کر نہ چلو۔ دوسروں کے ہاں اجازت لے کر جاؤ۔ دوسروں کے ہاں سے کوئی چیز لینی ہو تو دروازے سے باہر آواز دے کر مانگو وغیرہ وغیرہ اس طرح انہیں مہذب افرادِ معاشرہ بنانے کے لئے تدریجی تعلیم و تربیت دی گئی لیکن ان لوگوں میں بہت سے منافقین بھی تھے جو مدینہ منورہ میں رہتے ہوئے شر انگیزی پھیلاتے تھے۔ خاص طور پر عورتوں کے معاملے میں وہ بہت فتنہ خیز واقع ہوئے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسا طرزِ عمل آسان بھی ہوتا ہے اور مہلک بھی۔ اس موقع پر سورہ احزاب میں اللہ تعالےٰ نے نبی اکرمؐ سے فرمایا کہ "اپنی بیویوں، بیٹیوں اور مومنین کی عورتوں سے کہہ دو کہ وہ باہر نکلا کریں تو اپنے کپڑوں کے اوپر جلباب پہن لیا کریں"۔ اور اس حکم کی توجیہہ بھی ساتھ ہی کہہ دی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ذٰلِكَ أَدْنَىٰ أَن يُعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ط بات یہ تھی کہ جب خواتین باہر نکلتیں تو منافقین ان کو تنگ کرتے جب ان سے کہا جاتا کہ ایسا کیوں کرتے ہو تو وہ یہ جواب دیتے کہ ہمیں یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ شریف زادیاں ہیں یا نہیں۔ انکی اس حجت کو پورا کرنے کے لئے مومن خواتین سے کہا گیا کہ تم جلباب پہن کر باہر نکلو۔ اس سے تم پہچانی جاؤ گی کہ تم شریف عورتیں ہو۔ اور یہ لوگ تمہیں ستائیں گے نہیں اور اس سے اگلی ہی آیت میں ہے کہ اگر تمہاری اس احتیاطی تدبیر کے بعد بھی یہ لوگ اپنی حرکات سے باز نہ آئیں تو پھر ان سے مجرموں جیسا برتاؤ کرو۔ قرآن کریم کی بیان کردہ روشِ منافقین سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ عورتوں کے گھروں سے باہر نکلتے وقت خاص احتیاط برتنے کی تلقین و تاکید اس معاشرے کے خصوصی حالات کا تقاضا تھا اور ہر دور میں ایسے ہی خصوصی حالات میں اس کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ اصل چیز قرآنی تعلیم کی روح اور بنیاد ہے۔ جو ہمیشہ غیر متبدل رہے گی بس اس پر عمل پیرا

ہونے کے ذرائع حالات کے مطابق تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ اس بنیادی حقیقت کی روشنی میں پردہ کا قرآنی مفہوم سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں رہتی۔ اس کے تعلق سے سورہ النور میں پہلے مردوں کو غضِ بصر (نگاہیں نیچی رکھنا) اور تحفظِ عصمت کا حکم دیا گیا ہے اور بعد میں عورتوں کو۔ نگاہیں نیچی رکھنے سے مراد یہ ہے کہ اپنی نگاہوں کو آوارہ اور بے باک نہ ہونے دیا جائے۔ انہیں بے حیائی کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔ اسی لئے عورتوں سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ اپنی زینت و آرائش کی نمائش نہ کریں۔ بجز ان مقاماتِ زینت کے جن کا ظاہر ہونا ناگزیر ہو۔ جیسا کہ فرمانِ ربی ہے۔ یُبۡدِیۡنَ زِیۡنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنۡهَا۔ اسی مقصد کے لئے سورہ احزاب میں خمار اور جلباب کے استعمال کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اس زمانے میں عرب میں ان کا رواج تھا۔ جلباب ایسا کپڑا ہوتا ہے جسے دوسری جگہ جاتے وقت اوپر سے پہن لیا جائے۔ اب ظاہر ہے کہ خواہ خمار یعنی سر کی چادر سینے پر ڈال لی جائے اور خواہ اوپر سے جلباب پہن لی جائے۔ اس میں منہ چھپانے کا کوئی قرینہ نہیں۔ اگر منہ چھپانا ہی مقصود ہوتا تو مردوں کو تو غضِ بصر کا حکم نہ دیا جاتا۔ اگر معترضین کے نزدیک چہرہ ہی سب سے نمایاں مقامِ زینت ہے تو قرآن نے پہلے یہ کہا ہے کہ جو مقامات کھلے رہتے ہیں۔ ہاتھ پاؤں اور چہرہ ہی کھلے رہتے ہیں اور ان کا کھلا رہنا ناگزیر ہے۔ اور پھر اس نے خمار اور جلباب کو پہننے کا جو طریق بتایا ہے اس سے چہرہ کھلا رہے گا چھپے گا نہیں۔ اس سے یہ حق بات سامنے آتی ہے کہ چہرہ چھپانا منشائے قرآن نہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری نہیں کہ بعینہٖ اسی زمانے کے جلباب اور خمار کے مطابق ہی چادر یا اوڑھنیاں پہنی جائیں۔ قرآن کا مقصد تو یہ ہے کہ باہر نکلتے وقت نمودِ زینت مقصود نہ ہو۔ اور اس کے لئے جس قسم کا کپڑا بھی موزوں رہے اختیار کیا جائے۔ لباس کی وضع اور تراش خراش اندازِ معاشرت کے مطابق ہوتی ہے اور اس میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔ مگر قرآنی اصول ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے یعنی حیا اور شائستگی کا دامن چھٹنے نہ پائے۔ قرآن کریم نے زیب و زینت کو حرام قرار نہیں دیا اس لئے کہ زیب و زینت سے اپنے جذبہ تحسین وحسن کو تسکین ملتی ہے اور حسن وجمال کو پسند کرنا ہر با ذوق انسان کا وصف ہے لیکن زینت و آرائش کے تعلق سے قرآن یہ بھی تاکید کرتا ہے اور ہدایت دیتا ہے کہ اسے عہدِ جاہلیہ کے جذبۂ تبرج کا آلۂ کار نہ بنا لیا جائے۔ تبرج اس نمودِ حسن ونمائش زینت کو کہتے ہیں جس سے قلب و نگاہ آلودہ رکھنے والے افراد کے جذباتِ نفسانی بے قابو ہونے لگتے ہیں۔

قرآنِ حکیم مومن مردوں اور مومن عورتوں کی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ اَلۡحٰفِظِیۡنَ فُرُوۡجَهُمۡ وَالۡحٰفِظٰتِ یعنی اپنی عصمت کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں یہ ہے قرآن کا فیصلہ۔ اور قرآن پر بظاہر ایمان رکھنے والوں کا فیصلہ یہ ہے کہ تحفظِ عصمت کا مطالبہ صرف عورت سے کیا جائے گا مرد سے نہیں، اور اسی کو عورت کی حفاظت کہا جاتا ہے اسی لئے عصمت کے لفظ کو عورت کے ساتھ ہی چسپاں کر دیا گیا ہے۔ یا عصمت یا اس کے برعکس

عصمت فروش عورت ہوتی ہے۔ مرد نہیں ہوتا چنانچہ عورت یا عورتوں کے تحفظِ عصمت کا تو پرچار ہوتا ہے لیکن مردوں سے تحفظِ عصمت کا مطالبہ کرنے کی نہ کسی کو توفیق ہوتی ہے نہ اس کے لئے کوئی تحریک چلائی جاتی ہے۔ جب کہ قرآن میں تحفظِ عصمت کا حکم کسی جگہ بھی صرف عورتوں کے لئے نہیں آیا نہ ہی غضِ بصر کا قانون صرف عورتوں کے لئے بنایا گیا ہے اس لئے کہ معاشرے کی اصلاح یا بگاڑ کا دارومدار ہمیشہ مرد و عورت دونوں پر ہوتا ہے لیکن جہاں مردانہ معاشرہ کی کلیتاً عملداری ہو وہاں دن رات یہی پروپیگنڈا جاری و ساری رہتا ہے کہ اس معاشرہ کو عورتوں کی بداخلاقی و بے راہروی نے تباہ کر دیا ہے۔ بجائے اس کے بدکرداری کا جو عملی ارتکاب مردوں کی طرف سے ہوتا ہے اسے مرد کیونکر تسلیم کرلے اس نے تو یہ فتویٰ دے دیا ہے کہ عورتیں معاشرے میں بدنہادی پھیلا رہی ہیں۔ یہ معاشرے کیلئے دیمک ثابت ہو رہی ہیں اس لئے انہیں گھروں کے اندر بند کر دو کہ چادر اور چار دیواری کے تحفظ کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں یعنی عورت کی حفاظت ہو نہ ہو اسے تحفظ ملے نہ ملے چادر اور چار دیواری محفوظ ہو جائے۔ کوئی پوچھے۔ جب عورتوں کے گھروں سے باہر نکلنے پر اس مردانہ معاشرہ میں طوفان اٹھ کھڑا ہوتا ہے تو پھر گھروں کے اندر رہتے ہوئے انہی کے وجود سے مردوں کے یہ گھر کیونکر سلامت رہ سکتے ہیں یا رہ جاتے ہیں؟ آیئے! اپنی سوچ کا رُخ بدلیں۔ مرد کے ساتھ عورت کو بھی انسان سمجھیں تا کہ وہ بھی محفوظ زندگی بسر کر سکے!

ثریا عندلیب)

(بقیہ افکارِ پرویز کی صدی صفحہ (۴۸) سے آگے)

چونکہ کارگہِ فطرت میں خلا محال ہے اس لئے اس خلا کو بے آئینی پُر کر رہی ہے" جب انسان خدا کی پرستش سے بیگانہ ہو جاتا ہے تو شیطان کی پرستش شروع کر دیتا ہے،" یہ شیطان کی پرستش" ہے۔ وہ ہنگامی اسلوب معاشرت جو جنگ کے زمانہ میں پیدا ہوا اور اب ہماری زندگی کے ہر گوشے پر چھا رہا ہے۔ محبت، عقیدت، اخلاص، مروّت، اخوت، غرضیکہ شرفِ انسانیت کی تمام سوتیں خشک ہو چکی ہیں اور ان کی جگہ خود غرضی اور فریب دہی، مطلب پرستی اور بددیانتی منافقت اور بے ایمانی کے کثیف، اور بدعفونت گندے نالے بہہ رہے ہیں۔ غرضیکہ معاشرہ کی حالت وہاں پہنچ چکی ہے کہ اگر کچھ عرصہ اور یہی لیل و نہار رہے تو عجب نہیں کہ ہم اس عہدِ تاریکی میں جا پہنچیں جہاں انسان علم و تہذیب اور آئین و ضوابط کے دور سے پہلے تھا۔ اور ہماری زندگی، انسانی سطح سے نیچے گر کر حیوانیت کی درندگی کی سطح پر جا پہنچے۔

نمائندہ بزم کراچی (محمد اسلام صاحب) (جاری ہے)

سپین میں اسلام کی نشاۃِ ثانیہ

(ایک ہسپانوی نومسلم کے تاثرات)

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ یورپ کے ملک (SPAIN) سپین پر قرونِ اولیٰ میں مسلمانوں نے کم و بیش آٹھ سو سال تک حکومت کرنے کے بعد، جونہی اُن کی سیاسی قوت کا انحطاط ظاہر ہوا، آس پاس کی مسیحی ریاستوں نے اس وقت ایک متحدہ فوجی محاذ بنا کر اپنی نفری برتری اور مقدارِ اسلحہ کی بناء پر مسلمانوں کی حکومت کا سپین سے خاتمہ کر دیا تھا، بہر حال: تِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ کے فرمانِ الٰہی کی اتباع میں آج مسلمان اپنی ذہنی برتری اور مساعیٔ جمیلہ کے طفیل سپین میں اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کر رہے ہیں۔

دنیا میں فی الوقت متضاد اور عجیب و غریب نظریات کے حامل مذاہب اور عقائد کے پیروکار اپنے پیروکاروں کی تعداد بڑھانے کے جذبہ سے سرشار ہیں اور اس مقصد کے حصول کے لئے وہ ہر جائز و ناجائز طریق اختیار کر رہے ہیں۔ بااین ہمہ اسلام پھر ایک مرتبہ اپنی اندرونی (INTRINSIC) شان و شوکت کی بنیاد پر لوگوں کے دل جیت رہا ہے۔

جدید سپین کے ایک مشہور دانشور جناب عبدالحسیب کیبٹریہ نے ابھی چند سال پیشتر دینِ اسلام قبول کیا ہے، وہ لندن سے شائع ہونے والے مشہور اسلامی ماہنامے "عربیبا" کے نمائندے جناب محمد عبدالقیوم کو سپین میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے بارے میں بتاتے ہیں: یہ تفصیلات اس ماہنامے کی جولائی ۱۹۸۵ء کے شمارے میں شائع ہوئی ہیں جس کا ترجمہ قارئین طلوعِ اسلام کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔

نوٹ:

ادارہ ہذا کا مضمون نگار کے تاثرات سے اتفاق ضروری نہیں۔ (ادارہ)

فرماتے ہیں کہ وہ سپین کے پیشہ ور لکھنے والے اہل قلم ہیں۔ عمر ۲۹ سال کے لگ بھگ اور اقامت سپین کے مشہور شہر غرناطہ میں ہے جو اسلامی تہذیب و تمدن کا مرکز رہا ہے۔ ان کے خاندان کا تعلق شمالی سپین سے ہے اور والدین کٹر کیتھولک عیسائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ انہیں بھی دینِ اسلام کی طرف رہنمائی فرمائے۔

عیسائیت مجھے محض رسوم کا مجموعہ نظر آئی اور جونہی میں نے علمی ترقی کی بناء پر میڈرڈ یونیورسٹی

میں داخلہ لیا تو عیسائیت کے ساتھ میرا تعلق کمزور پڑتا گیا۔ کیونکہ میں نے محسوس کیا کہ عیسائیت کے پاس اُن بہت سے سوالوں کا جواب نہیں ہے جو موجودہ دور کے بدلتے ہوئے حالات نے پیدا کئے ہیں اور نہ ہی مجھے عیسائیت سے کوئی روحانی تسکین حاصل ہو رہی تھی اور جب میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ مذہب محض دکھلاوا ہے اور اس میں حقیقت کچھ نہیں، تو میں نے مشرقِ بعید کے بعض مذاہب کا مطالعہ شروع کر دیا۔ ان مذاہب میں، جین مت، بدھ مت، ہندو مت وغیرہ شامل تھے، میں روحانی تسکین کی تلاش میں تھا۔ لیکن مجھے مایوسی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔ چنانچہ ان تمام مذاہب سے مایوس ہو کر میں نے ملکی سیاست میں دلچسپی لینی شروع کی کیونکہ اُس وقت سپین کے "مردِ آہن" جنرل فرانکو کے خلاف تحریک کی وجہ سے سیاست میں کافی گرم جوشی پیدا ہو چکی تھی۔

اُس وقت تک بندہ نے دین اسلام کے مطالعے میں کوئی دلچسپی نہیں لی تھی۔ دراصل جب سے سپین میں مسلمانوں کی حکومت کا خاتمہ کیا گیا تھا۔ اس وقت سے ہی عیسائی مسلمانوں کے ساتھ سخت سلوک کرنے لگے تھے، تاہم میڈرڈ یونیورسٹی میں، میرے دوستوں کے ایک گروپ نے برضا و رغبت اسلام قبول کر لیا تھا۔ ہم سب مل کر کسی ایسے مذہب کی تلاش میں سرگرداں تھے جو ہمیں سکون میسّر کر سکے۔

میرے یہ دوست ایک دفعہ لنڈن گئے تھے اور وہاں ہندو اور سکھ مذہب کے مبلغوں سے ملے تھے کیونکہ وہ تبدیلیٔ مذہب کا تجربہ کرنا چاہتے تھے۔ آخر میں ان کی ملاقات برطانوی مسلمانوں کے ایک گروپ سے ہوئی جن کی زندگیوں میں اسلام قبول کرنے کی وجہ سے "انقلاب" آچکا تھا۔ وہ ان کی زندگیوں سے کافی متاثر ہوئے۔ کیونکہ اس تبدیلی کے بعد وہ بلند تر انسان معلوم ہو رہے تھے۔ چنانچہ میرے دوستوں نے ان سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیا تھا۔

اس واقعہ کے ڈیڑھ سال بعد، راقم بھی ان انگریز نومسلموں سے ملا۔ اور کچھ وقت کے لئے ان کے پاس ٹھہرا۔ اُن کی شرافت، اخلاص اور اعلیٰ مہمان نوازی سے بڑا متاثر ہوا۔ روزانہ پنجگانہ نمازوں کی ادائیگی کی وجہ سے ان کی شخصیتوں اور اخلاق میں تبدیلی رونما ہو چکی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان عبادات کی وجہ سے انہیں قرب الٰہی حاصل ہو چکا ہے جو دینِ اسلام کا مقصود ہے اور یہ مقصود بغیر کسی مولوی یا پیر کے درمیانی واسطے سے ہر مسلمان کو حاصل ہو جاتا ہے۔ اس زمانے میں انگلستان میں (NORWICH) کے مقام پر ایک اسلامی کانفرنس ہو رہی تھی جس میں شمولیت کی دعوت مجھے بھی دی گئی۔ وہاں مجھے اسلام کی معاشرتی زندگی کا مطالعہ کرنے کا قریب سے موقع ملا اور میں نے یکم رمضان ۱۳۹۶ھ کو اسلام قبول کر لیا۔ اس طرح میں نے اسلامی عبادات میں سے نماز اور روزہ کی پابندی اکٹھی شروع کی، اسلام نے مجھے اس طرح مطمئن کر دیا کہ بعد میں مجھے اپنی تبدیلیٔ مذہب کے بارے میں کوئی خلش محسوس نہ ہوئی۔ بلکہ میں نے اپنے آپ کو پہلے

سے بھی زیادہ تر و تازہ محسوس کیا، حالانکہ میرا سارا دن کھانے پینے کے بغیر گزرتا تھا۔ لیکن مقصد چونکہ اللہ تعالیٰ کی رضا مندی حاصل کرنا تھا اس لئے تکلیف کی بجائے فرحت محسوس ہوتی تھی۔

مجھے اس وقت اسلام قبول کئے ہوئے نو سال ہو چکے ہیں۔ یہ تمام سال میں نے حتی الوسع اسلام کی خدمت میں گزارے ہیں پہلے چند سالوں میں تو میں نے قرآن مجید کا گہری نظر سے مطالعہ کیا اور عربی زبان سیکھی، سپین میں مسلمانوں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے اور اس سے حوصلہ پا کر، ہم نے یہاں بہت سی اسلامی کانفرنسیں منعقد کی ہیں، تبلیغی دورے کئے ہیں اور موجودہ دور کے ذرائع ابلاغ یعنی اخبارات اور ٹی وی سے اسلام کی تبلیغ کا کام لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اب قرطبہ، غرناطہ اور سیوائیل میں مسلمانوں کی تعداد پانچ صد ہو چکی ہے۔ اور اسلام کا شاندار پیغام سپین میں روز بروز پھیل رہا ہے۔

میں نے سپین میں مسلمانوں کی علمی ضروریات پوری کرنے کے لئے ایک اشاعت گھر "کتبہ" کے نام سے جاری کر رکھا ہے، اور دو سال سے سپینی زبان میں ایک اسلامی ماہنامہ "ہالس اسلامیکو" جس کا ترجمہ اسلامی دنیا بنتا ہے، جاری کر رکھا ہے۔ اس ماہنامے کے ذریعے، جنوبی امریکہ کے ان ممالک میں بھی اسلام کا پیغام پہنچایا جا رہا ہے جہاں سپینی زبان بولی جاتی ہے۔ ان لوگوں تک پچھلے پانچ سو سالوں سے اسلام کا پیغام نہیں پہنچایا گیا تھا اس لئے وہ میرے رسالے کو بڑے شوق سے پڑھتے ہیں، بہت سے غیر مسلم بھی اس رسالے کے خریدار ہیں، کیونکہ اس میں اسلام کے تاریخی لٹریچر اور اسلامی دنیا کی بابت مختلف النوع مضمون شائع کئے جاتے ہیں۔ عربی زبان سکھانے کے اسباق اس کے علاوہ ہیں، جو بڑے مقبول ہو رہے ہیں۔

اس ماہنامے کے اثر کی وجہ سے، جنوبی امریکہ کے بعض ممالک، میکسیکو، پانامہ اور پورٹوریکو میں اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے اور وہاں اس رسالے کی خریداری بڑھ رہی ہے، یہ لوگ اس ماہنامے کے مطالعے کے بعد مجھ سے اسلام کے بعض مسائل کے بارے میں وضاحت کے لئے لکھتے رہتے ہیں اور اسلام پر مطبوعات طلب کرتے رہتے ہیں، تاکہ اس بارے میں وہ اپنی معلومات بڑھا سکیں، میرے قارئین سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے مشاہیر اسلام کی زندگیوں کے حالات بڑے شوق سے پڑھتے ہیں کیونکہ سپینی زبان میں اس موضوع پر پہلے کوئی لٹریچر نہ تھا۔

سپین میں، اسلام کی طرف لوگوں کا رجحان حیرت انگیز ہے اور بہت ہی قلیل عرصے میں سینکڑوں لوگوں نے اپنی خوشی سے اسلام قبول کیا ہے۔ اگر یہاں منظم طریقے سے، اسلام کی تبلیغ کا کام کیا جائے تو اس کے حوصلہ افزا نتائج برآمد ہو سکتے ہیں میں اس کام میں اپنی ہمت کے مطابق مشغول ہوں اور ہم سب مل کر جتنی زیادہ تبلیغ کریں گے انشاء اللہ یہاں کے غیر مسلموں کو دین اسلام کی حقیقت کا قائل کر دیں گے اس طرح تھوڑے ہی عرصے میں سپین میں مسلمانوں کی تعداد ہزاروں تک جا پہنچے گی۔ اس موسم گرما میں میرا جنوبی امریکہ کے سپینی زبان بولنے والے ممالک کا دورہ کرنے کا پروگرام ہے، مجھے امید ہے کہ اس نئی دنیا میں اسلام خوب ترقی کریگا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اسلام کی ترقی کیلئے کام کرنے کی توفیق دے اور ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت کرے (آمین)

قرآنی اسلام کیا ہے؟

(فکرِ پرویز کی روشنی میں)

مرتبہ
(مقصود حسین کیانی) (لندن) یوکے

قرانِ مجید کے مطابق خدا تعالیٰ کا تخلیقی عمل دو مراحل میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ پہلا مرحلہ وہ جس میں اشیائے کائنات کو عدم سے وجود میں لایا جاتا ہے۔ اس دائرہ کار میں خدا کی مشیت جس طرح چاہتی ہے، عمل کرتی ہے اور اشیائے کائنات کی جو خصوصیات مناسب سمجھتی ہے مقرر کرتی ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں اس مرحلہ کو عالم امر کہا جاتا ہے۔ اس تخلیقی عمل کے جس مقام پر اشیائے کائنات وجود انگیز ہونے لگتی ہیں، اسے عالم خلق کہا جاتا ہے۔ اس مرحلہ میں پہنچ کر ہر شے اپنی اس تقدیر کی طرف تدریجاً قدم بڑھاتی ہے جو اس کے لئے عالم امر میں مقرر کی گئی تھی۔ عالم خلق میں وہ قوانین جو مشیتِ خداوندی عالم امر میں متعین کرتی ہے، ہمیشہ غیر متبدل رہتے ہیں۔ ان میں کبھی ردوبدل نہیں ہوتا۔ خدا کا عملِ تخلیق یکبارگی اپنی نمود کر کے ختم نہیں ہو گیا بلکہ اس کا یہ فعل، عالم امر میں ہر آن جاری و ساری ہے اور یوں وہ کائنات میں نت نئے اضافے کرتا رہتا ہے۔ غالبؔ کے الفاظ میں:۔

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز رہتا ہے آئینہ ابھی دائم نقاب میں

تمام اشیائے کائنات مجبور محض ہیں۔ انہیں جس نہج زندگی پر چلنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے وہ اس سے سرتابی نہیں کر سکتیں۔ تخلیقِ کائنات کے اس سلسلۂ ارتقاء میں، مشیت کے پروگرام کے مطابق، زندگی نے ایک مقام پر نئی کروٹ بدلی۔ اس کے نتیجے میں ایک نئی مخلوق وجود میں آئی جسے آدم کہا جاتا ہے۔ اس مخلوق کو خدا نے اپنی الوہیاتی توانائی سے متصف کر کے صاحبِ اختیار و ارادہ بنا دیا اور یوں اسے دیگر جملہ اشیائے کائنات میں ایک منفرد مقام حاصل ہو گیا۔ اختیار و ارادہ کی نعمت سے سرفراز ہونے کے باعث انسان کسی مخصوص اور متعین راہ پر چلنے کا پابند نہ رہا۔ اب یہ بات اس کے اپنے اختیار و ارادہ پر چھوڑ دی گئی کہ وہ اپنے لئے جونسی راہ چاہے اختیار کر لے۔

انسان کے علاوہ جتنی مخلوق ہے، اسے جس راہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے، وہ اسے ودیعت کر دی جاتی ہے۔ لیکن انسان کے اختیار و ارادہ کی خصوصیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے، خدا نے اس کی راہنمائی کے لئے بھی جداگانہ انداز مقرر کیا ہے۔ خدا، انسانوں ہی میں سے کسی

برگزیدہ ہستی کو فریضۂ رسالت کے لئے منتخب کرنا، اسے بذریعہ وحی وہ نظریاتِ حیات عطا کرنا جسے الدین کہا جاتا ہے۔ نبی، وحی سے سرفراز ہو کر قومِ مخاطب کو سمجھاتا کہ جس طرح خارجی کائنات میں خدا کی خدائی کارفرما ہے، اسی طرح انسانوں کو بھی اپنی تمدنی زندگی تو اپنی خداوندی کے مطابق بسر کرنی چاہیئے تاکہ یوں ان کے نظامِ زندگی میں بھی ویسا ہی حسن وتناسب اور نظم وضبط پیدا ہو جائے جو خارجی دنیا میں دکھائی دیتا ہے۔ اس ہدایت وراہنمائی پر عمل پیرا ہونے کے لئے نہ تو خدا انسانوں کو مجبور کرتا اور نہ ہی نبی خوق الفطرت کرشمہ سازیوں سے ان کی عقل وفکر کو ماؤف کر کے اسے اپنانے کی ترغیب دیتا۔ وہ اپنا پیغام دلائل وبراہین سے پیش کرتا اور قومِ مخاطب کو اسے علیٰ وجہ البصیرت قبول کرنے کی دعوت دیتا۔ یہ اصولی تعلیم تمام انبیاء کرام کو یکساں ملتی رہی تا آنکہ اسے نبی اکرم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ ہمایوں میں ہر طرح سے مکمل کر کے قرآن کی دفتین میں ابدالآباد تک محفوظ کر دیا اور اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا۔

قرآنی نظریۂ زندگی کے مطابق انسان محض عناصر کے ظہورِ ترتیب کا نتیجہ نہیں کہ جو ان اجزاء کے پریشان ہونے سے فنا ہو جاتا ہے بلکہ اس کے مادی پیکر میں الوہیاتی توانائی کا ایک ایسا شمہ رکھ دیا گیا ہے کہ اگر اس کی پوری طرح نشوونما کر لی جائے تو وہ موت کے جھٹکے سے بھی نہیں بکھرتا۔ موت سفرِ زندگی میں اس کے لئے اک وقفہ ہوتی ہے جس کے بعد وہ دم لے کر اگلی منزل کی طرف رواں دواں چلنے لگتا ہے۔

قرآنی تصورِ حیات کا عمودی نکتہ مکافاتِ عمل ہے۔ اس کے مطابق ہر انسانی عمل اس کی ذات پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ہر شخص اپنے عمل کا بیج بوتا اور اس کے جزا یا سزا کی فصل کاٹتا ہے۔ کسی کے اچھے یا برے اعمال کے نتائج دوسرے کی طرف منتقل نہیں کئے جا سکتے۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا، دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔ وہ اعمال جو احکامِ خداوندی سے ہم آہنگ ہوتے ہیں، تعمیرِ ذات کا سبب بنتے ہیں اور جو انکی خلاف ورزی میں ہوتے ہیں، ذات کے ضعف و اضمحلال کا باعث ہوتے ہیں۔ برے اعمال سے ذات پر جو مضرت رساں اثرات مرتب ہوتے ہیں وہ ابدی نہیں ہوتے۔ اگر انسان چاہے تو اعمالِ صالحہ سے انہیں زائل کر سکتا ہے۔

انسانی ذات پر ایمان کا لازمی نتیجہ خدا پر ایمان ہے۔ ذات کی نشوونما کو جانچنے اور پرکھنے کے لئے کسی خارجی معیار کا ہونا ضروری ہے۔ اور یہ معیار وہ صفاتِ خداوندی ہوتی ہیں جنہیں اسماء الحسنیٰ کہا گیا ہے۔ ان کی روشنی میں یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ انسان کہاں تک خدا کے رنگ میں رنگا جا رہا ہے۔ یوں یہ ایمان کوئی نظری یا اعتقادی نہیں رہتا بلکہ عملی صورت اختیار کر لیتا ہے اور انسان خود موازنہ کرتا جاتا ہے کہ اس میں علیٰ حدِ بشریت، خدائی صفات۔ ان چند ایک صفات کو چھوڑ کر جو صرف ذاتِ خداوندی کا خاصا ہیں۔ کہاں تک منعکس ہوتی جا رہی ہیں۔ انسانی ذات کی نمو انفرادی طور پر نہیں ہو سکتی، یہ اجتماعی نظام ہی میں ممکن ہوتی ہے۔ جہاں اسے عملی زندگی کے مواقعات

و مشکلات سے دوچار ہو کر اپنی خوابیدہ اور مضمر صلاحیتوں کی برومندی کے مواقع میسر آتے ہیں۔ یہ مقصد صرف اسی نظامِ تمدن میں حاصل ہو سکتا ہے جو قرآنی خطوط پر متشکل ہو۔ ایسے نظامِ معاشرہ کی ترویج و تنفیذ، اقامتِ صلوٰۃ کہلاتی ہے جہاں ہر مسلمان اپنے فرائضِ حیات کی بجا آوری کیلئے ہدایتِ خداوندی کے پیچھے پیچھے چلتا جاتا ہے۔

قرآنی تصورِ حیات کے مطابق جس طرح جسم کی پرورش "لینے" سے ہوتی ہے اسی طرح انسانی ذات کی بالیدگی "دینے" سے ہوتی ہے۔ اقدارِ خداوندی پر ایمان رکھنے والا ہر فرد اپنی خداداد صلاحیتوں کے مطابق اپنے مفوضہ فرائض پوری جانفشانی اور تن دہی سے بجا لاتا اور ان کے ماحصل کو اپنی جائز ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کے بعد دیگر افرادِ معاشرہ کی فلاح و بہبود کے لئے کھلا رکھتا ہے۔ جو قوم ایسے افراد سے متشکل ہوتی ہے وہ رزق کے سرچشموں کو بہتے پانی کی مانند کھلا رکھتی ہے تاکہ ہر ضرورت مند اپنی احتیاج کے مطابق ان سے سیراب ہوتا رہے، سامانِ رزق کی فراہمی کیلئے امکان بھر کوشش کرنا اور اسے ربوبیتِ عامہ کے لئے اس طرح استعمال کرنا کہ خدا کی صفتِ رحیمیت اور رحمانیت کا ہر آن ظہور ہوتا رہے، فریضۂ ایتائے زکوٰۃ کہلاتا ہے۔ اس فریضہ کو حسن و خوبی سر انجام دینے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ ملتِ اسلامیہ، فطرت کی قوتوں کو زیادہ سے زیادہ مسخر کرے اور یوں اسے جو منفعتیں حاصل ہوں، انہیں اقدارِ خداوندی کے مطابق بنی نوعِ انسان کی بہبود پر خرچ کرے۔ قرآنی تصورِ حیات میں ایمان کو بڑی بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے بغیر قرآنی معاشرہ کی تعمیر ممکن نہیں ہو سکتی۔ ایمان ابدی صداقتوں کو علیٰ وجہ البصیرت قبول کرنے کا نام ہے۔ جو ایمان جبر و اکراہ، اندھی تقلید یا پیدائشی حادثہ کا نتیجہ ہو وہ قرآن کی میزان میں کچھ قدر و قیمت نہیں رکھتا۔ قرآن بیّنات پیش کرتا اور عقل و فکر کو دعوت دیتا ہے۔ اس نظریۂ حیات کے مطابق خارج میں حقیقی اور پائیدار انقلاب لانے کے لئے تغیرِ نفس ضروری ہے اور یہ تغیر صرف وہی ایمان پیدا کر سکتا ہے جو سوچ سمجھ کر برضاء و رغبت لایا گیا ہو اور یوں وہ دل کا تقاضا بن چکا ہو۔

جس نظام کا بنیادی مقصد تعمیرِ ذات ہو وہ جبر و اکراہ کو خواہ اسکی شکل کچھ بھی کیوں نہ ہو، روا نہیں رکھ سکتا۔ وہاں اس بنیادی حقیقت کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھا جاتا ہے کہ جب خدا نے، جو تمام تر قوتوں کا مالک ہے، انسانوں کو کسی خاص نہجِ زندگی اور طرزِ زیست پر چلنے کے لئے مجبور پیدا نہیں کیا تو پھر یہ اختیار کسی انسان کو کیونکر دیا جا سکتا ہے کہ وہ دوسروں پر اپنی مرضی چلا لے۔ اس معاشرہ میں بچوں کی تعلیم و تربیت اس محور کو سامنے رکھ کر کی جاتی ہے کہ ہر انسانی بچہ انسان ہونے کی جہت سے قابلِ احترام ہے۔ انسان اور انسان میں کسی قسم کی کوئی تمیز اور تفریق روا نہیں رکھی جا سکتی، فضیلت کا معیار رنگ یا نسل نہیں ہوتا بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ کون قوانینِ خداوندی کی کتنی نگہداشت کرتا ہے۔ حکمرانی کا حق صرف ذاتِ خداوندی کو حاصل ہے اور اس کا عملی طریق کتاب اللہ

کی اطاعت ہے۔ قانون سازی کا عمل باہمی مشاورت سے، قوانین خداوندی کی حدود میں رہ کر پورا کیا جاتا ہے۔ یوں جو جزوی قوانین بنائے جاتے ہیں وہ قوانینِ شریعت کہلاتے ہیں جو قرآن کے قوانین، احکام اور اقدار کی مانند غیر متبدل نہیں ہوتے بلکہ وقت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان میں ردوبدل کیا جاسکتا ہے۔ اس ردّوبدل کا اختیار کسی فرد کو حاصل نہیں ہوتا۔ اس کا مجاز مرکزِ ملّت ہوتا ہے۔

جماعتِ مومنین کا یہ بھی فریضہ ہے کہ وہ اقوامِ عالم کے اعمال کی نگرانی کرے۔ اس پر کڑی نگاہ رکھے کہ کہیں کسی پر ظلم نہ ہونے پائے۔ کسی کی مذہبی آزادی کو سلب نہ کیا جائے اور نہ ہی کسی کے انسانی حقوق پائمال ہونے پائیں۔ جہاں کہیں بھی ایسے حالات پیدا ہونے کا امکان ہو یہ ان کے مداوا کی ہر ممکن کوشش کرے۔ اس جدوجہد کا جذبۂ محرکہ فقط ظلم کا انسداد اور ناانصافی کی روک تھام ہوگا۔ جُوعِ الارض یا استحصال سے اس کا دامن ہمیشہ پاک رہے گا۔

ملّت کے داخلی اور خارجی معاملات پر غوروفکر کرنے اور عالمِ انسانیت کے الجھے ہوئے معاملات کو سلجھانے کی غرض سے ہرسال اسلامی حکومت اپنے مرکز کعبہ میں سالانہ اجتماع کا اہتمام کرتی ہے اور تمام اقوامِ عالم کو جنہیں انسانیت کی بھلائی مرغوب ہوتی ہے، دعوتِ عام دیتی ہے کہ وہ اس اجتماع میں شریک ہوکر خود مشاہدہ کریں کہ جماعتِ مومنین بنی نوعِ انسان کی فلاح کے لئے کیا کیا عملی تدابیر اختیار کر رہی ہے۔ اس سالانہ اجتماع کو حج کہا جاتا ہے جہاں جملہ معاملات جذبات سے الگ ہوکر حُجّت اور دلیل سے طے کئے جاتے ہیں۔

اسلام توحید کا علمبردار ہے۔ اس نظریہ کا منطقی نتیجہ بنی نوعِ انسان کی وحدت پر ایمان لانا ہوتا ہے اس تصور کے باعث جغرافیائی وطن پرستی، رنگ ونسل اور زبان کے امتیازات ختم ہو جاتے ہیں۔ توحید تمام تر اضافی نسبتوں کو چھوڑ کر احترامِ انسانیّت کا درس دیتی ہے اور رسولِ انسان اپنے عمل کے اعتبار سے "الخلق عیال اللّٰہ" کے اصول پر کاربند ہوجاتا ہے۔

انسانی ذات پر ایمان اور حیات بعد الممات کا عقیدہ لازم وملزوم ہیں۔ زندگی کا دھارا مسلسل اور متواتر آگے بڑھتا رہتا ہے۔ جو اعمال اس دنیا میں نتیجہ خیز ہونے سے رہ جاتے ہیں ان کے نتائج اگلی زندگی میں سامنے آجاتے ہیں۔ نشوونما یافتہ ذات، حیاتِ جاوید سے ہمکنار ہوکر جنتی زندگی کی شادابیوں اور کامیابیوں سے سرفراز ہوتی ہے۔ غیر نشوونما یافتہ ذات کی (SURVIVAL) تو ہوتی ہے لیکن اس کا مزید ارتقاء رُک جاتا ہے۔ اسے جہنم کی زندگی کہا جاتا ہے۔

جنت اور جہنم کی زندگی، جہانِ فردا ہی کا لازمہ نہیں بلکہ اس کا سلسلہ تو اسی جہانِ رنگ وبو سے شروع ہو جاتا ہے۔ موت کے بعد زندگی کونسا روپ اختیار کرتی ہے اور اس کی ماہیّت کیا ہوتی ہے، اسے ہم شعور کی موجودہ سطح پر نہیں سمجھ سکتے۔ شاید اسی دشواری کا احساس کرتے ہوئے اقبالؒ نے یہ کہا تھا کہ ؂

خرد مندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتداء کیا ہے ... کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے

زرعی اراضی کی حدِ ملکیّت کے بارے میں نئی بحث

زرعی اراضی کی حد ملکیت کے سلسلے میں بنیادی حقیقت تو یہی ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے زمین پر ذاتی ملکیت نہیں ہوسکتی لیکن خلافتِ اسلامیہ کے ملوکیت میں بدل جانے کی وجہ سے ان صاف اور سادہ مسائل کو قرآن حکیم کی روشنی میں حل کرنے کی بجائے انہیں مختلف زمانوں کے معاشرتی رواجوں کے مطابق حل کرنے کی نت نئی کوششوں نے الجھاؤ پر الجھاؤ بڑھا دیا اور اس وقت بھی ہنوز روزِ اوّل والا معاملہ درپیش ہے۔ چنانچہ اِس دفعہ بھی انتخابات کے بعد اس بحث کا از سرِنو آغاز کیا گیا ہے اور مختلف سیاسی جماعتیں بھی ۔ ۔ ذاتی ملکیت کی حد کا اعلان از سرِنو کر رہی ہیں اور قومی اخبارات اس سلسلے میں مذاکروں کا اہتمام کر رہے ہیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ اس سلسلے میں جو بحث بھی کی جا رہی ہے اس میں اسلام کا نقطۂ نظر پیش نہیں کیا جا رہا۔ حد تو یہ ہے کہ روزنامہ جنگ لاہور نے اس موضوع پر جس مذاکرے کا انتظام کیا تھا، اس میں علماء کی بھی ایک خاصی تعداد موجود تھی۔ لیکن ان میں سے کسی نے اس بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر پیش نہیں کیا۔

زرعی اراضی کی حدِ ملکیت کا مسئلہ قیامِ پاکستان کے وقت ہی سے، ہمارے سیاستدانوں کی توجہ کا مرکز بنا رہا ہے ہر سیاسی جماعت نے اس سلسلے میں بڑے لمبے چوڑے وعدے کئے لیکن برسرِ اقتدار آنے کے بعد وہ اپنے دعووں کو بھول گئے۔ بلاشبہ کچھ سیاسی جماعتوں نے عملی اقدامات بھی اٹھائے لیکن یہ اقدامات عوام کو بیوقوف بنانے کے لئے کئے گئے تھے۔ بڑے بڑے زمینداروں کو ان اقدامات کا علم پیشگی ہو جاتا تھا اور وہ اپنی زائد اراضی، خاندان کے مختلف افراد کے نام منتقل کرا لیتے تھے۔ اس صورت حالات نے عوام کو سیاسی لیڈروں سے متنفر کر دیا۔ چنانچہ انہیں مزید بیوقوف بنانے کے لئے ان سیاسی لیڈروں نے اسلام کے نعرے لگانے شروع کئے۔

سابقہ حکومت کے خلاف جس قومی اتحاد کو تشکیل دیا گیا تھا، اس میں ملک کی سرکردہ نو عدد سیاسی پارٹیاں شامل تھیں، ان میں سے تین چار پارٹیوں کے سربراہ ملک کے سرکردہ عالم دین تھے یعنی سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم، مفتی محمود ، مرحوم اور (مولانا) شاہ احمد نورانی۔ ان حضرات کی نگرانی میں، قومی اتحاد کا جو منشور مرتب کیا گیا، اس میں اراضی کی حدِ ملکیت

کے بارے میں اسلام کے واضح حکم کو اختیار کیا گیا۔ جو اس منشور کے صفحہ ۱۶ پر ان الفاظ میں مرقوم ہے کہ چونکہ زمین کی بٹائی یا غیر حاضر زمینداری کا نظام، شریعت اسلامی کے خلاف ہے۔ اس لئے جب قومی اتحاد برسر اقتدار آئے گا تو وہ اسے ختم کرکے، اسلامی تعلیمات کے مطابق ہر کاشتکار کے پاس صرف اتنی زمین رہنے دے گا جو وہ خود کاشت کر سکے گا۔ اسی نسبت سے "ہل" کو قومی اتحاد کا انتخابی نشان قرار دیا گیا۔

قومی اتحاد کا یہ فیصلہ شریعت اسلامی کی تعلیمات کے عین مطابق تھا۔ کیونکہ شریعت اسلامی نے زمین کی بٹائی کے معاملے کو سودی معاملہ قرار دے کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسے حرام قرار دے دیا تھا، اس بارے میں قرآن مجید میں واضح احکامات موجود ہیں اور رسول اللہ صلعم نے خود اس معاملے کو سود قرار دے کر اس کے ناجائز ہونے کا اعلان فرما دیا تھا۔

رسول اللہ صلعم کے اس اعلان کا ایک منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ زمین کی خرید و فروخت ممکن نہ رہی، کاشت کرنے والے غریب مزارع، اس حالت میں نہ تھے کہ وہ زرعی اراضی خرید سکتے۔ قرآن مجید نے بھی زمین کے بارے میں سواءً لِلسَّائِلِين فرما کر اس پر مہر تصدیق ثبت فرما دی۔ لیکن بعض صحابہ کے پاس ان کی خود کاشت سے زیادہ اراضی تھی جو بٹائی کے حرام قرار دیئے جانے کے بعد وہ فروخت کرنا چاہتے تھے، لیکن اس بارے میں جب رسول اللہ صلعم سے دریافت کیا گیا تو آپ نے زمین فروخت کرنے سے منع فرماتے ہوئے، ان صحابہ کو تلقین کی کہ وہ اپنی زائد اراضی اپنے کاشتکار بھائیوں کو مفت دے دیں۔

قومی اتحاد نے انہی اسلامی تعلیمات کو اپنے منشور کا حصّہ بنا لیا۔ اس کا یہ منشور لاکھوں کی تعداد میں شائع کر کے تقسیم کیا گیا۔ پھر اسے تمام قومی اخبارات نے لفظ بلفظ شائع بھی کیا لیکن کسی عالم دین نے اس بارے میں کوئی اعتراض نہ اٹھایا۔ تو شرعی اصولوں کے مطابق اس مسئلہ پر اجماعِ امّت ہوگیا اور اس سے روگردانی، اسلام کی مخالفت قرار پائی ہے۔

قومی اتحاد، برسرِ اقتدار نہ آسکا، اس لئے وہ اپنے اس منشور کو عملی جامہ نہ پہنا سکا،

لیکن اب اسی قومی اتحاد میں شامل ہونے والی مختلف سیاسی جماعتیں، اپنے بنائے ہوئے اس منشور سے روگردانی کر رہی ہیں، یعنی جس چیز کو انہوں نے اپنے منشور میں خالص اسلام قرار دیا تھا اب اس کی خود ہی مخالفت کر رہی ہیں اور اس کے برخلاف زرعی اراضی کے لئے نئی حد مقرر کرنے کے وعدے کر رہی ہیں۔ تحریکِ استقلال نے پچیس ایکڑ کی حد مقرر کی ہے۔ جب کہ جماعت اسلامی نے یہ حد ڈیڑھ صد ایکڑ کی مقرر کی ہے، افسوس کی بات ہے کہ یہ نئی حدیں مقرر کرتے وقت، ان پارٹیوں نے بھول کر بھی، اپنے پرانے منشور کی طرف اشارہ تک نہیں کیا۔ ہمارے سیاستدان،

عام طور پر اس اصول پر کام کرتے ہیں کہ ہمارے عوام کا حافظہ کمزور ہے اور وہ پچھلے وعدوں کو بھول جاتے ہیں۔ لیکن ان کا حافظہ اتنا بھی کمزور نہیں، جتنا کہ سمجھا جاتا ہے۔ اہم قومی مسائل کے بارے میں ہمارے سیاستدانوں کے اس طرزِ عمل کی وجہ سے، عوام میں ان کی ساکھ کم ہو جاتی ہے، اس لئے جب سیاستدان دوبارہ کوئی تحریک اٹھاتے ہیں، تو عوام کی اکثریت پچھلے تلخ تجربے کی وجہ سے ان کا ساتھ نہیں دیتی۔ اور سیاستدان عوام کی بے حسی کا رونا رونے لگ جاتے ہیں۔

عوام کی بے حسی کی شکایت کرنے کی بجائے، ان لوگوں کو، عوام کو اپنے اعتماد میں لینا چاہیئے، اگر وہ اپنے قومی اتحاد والے منشور سے پہلوتہی کر رہے ہیں تو اس تبدیلی کے بارے میں اُنہیں عوام کو قائل کرنا چاہیئے کہ وہ کس بناء پر اپنے سابقہ منشور پر قائم نہ رہ سکے۔ انہیں اس امر کا خیال رکھنا چاہیئے کہ وہ زیادہ عرصے تک عوام کو بے وقوف نہیں بنا سکتے۔

(محمد ارمغان ثاقب)

نوٹ:۔ ماہِ اگست کے شمارے میں صفحہ نمبر ۶۳ پر عالم اسلامی کے تحت ۱۹۸۴ء کی بجائے ۱۹۴۸ء پڑھا جائے۔

ضرورت اساتذہ (خواتین)

اقراء قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی فیصل آباد کے زیرِ انتظام سکول کی نرسری / پریپریٹری کلاسز کے لئے قرآنی فکر سے منسلک مشنری جذبہ رکھنے والی اساتذہ سے درخواستیں مطلوب ہیں۔ اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی درخواستیں مکمل کوائف کی تصدیق شدہ کاپیوں کے ساتھ زیرِ دستخطی کو ۱۵ نومبر ۱۹۸۵ء تک پہنچ جانی چاہئیں۔ تنخواہ اور دوسری شرائطِ ملازمت حسب تجربہ و تعلیمی استعداد بوقت انٹرویو طے کی جائیں گی۔

تعلیمی قابلیت (۱) ایف اے سی ٹی۔ بی اے بی ایڈ

بی ایس سی (فائن آرٹ / ہوم اکنامکس)

(۲) قرآن سمجھنے کی استعداد اور فکرِ قرآنی سے آگاہی ضروری تصور ہو گی۔

(ڈاکٹر محمد حیات ملک صدر اقراء قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی

۲۳/۷ پیپلز کالونی فیصل آباد

مطالبُ الفرقان جلد ششم

اس میں سورۃ الاعراف کی آیات (۱۵۹ تا ۲۰۶) سورۃ انفال کی کُل آیات (۱ تا ۷۵) سورۃ توبہ کی کل آیات (۱ تا ۱۲۹) سورۃ یونس کی کل آیات (۱ تا ۱۰۹) اور سورۃ ھود کی کل آیات (۱ تا ۱۲۳) آگئی ہیں، جو بیشتر مشتمل ہیں حضراتِ انبیاء سابقہ کے کوائفِ حیات اور اقوام گذشتہ کے نہایت عبرت خیز واقعات پر، جو احباب سلسلۂ مطالبُ الفرقان کا مطالعہ کر چکے ہیں وہ جانتے ہیں کہ تصریفِ آیات کے اصول کے مطابق جس طرح قرآنِ مجید کی تفسیر، ان مجلدات میں پیش کی جا رہی ہیں اس سے قرآنی حقائق کسطرح نکھر کر سامنے آجاتے ہیں۔

یہ جلد اعلیٰ درجہ کے سفید کاغذ کے (۴۳۶) صفحات پر پھیلی ہوئی ہے
کتابت، طباعت، جلد، سابقہ جلدوں کے معیار کے مطابق، عمدہ اور دلکش۔
قیمت فی جلد -/۷۵ روپے
محصول ڈاک۔ -/۸ روپے

ملنے کا پتہ

۱۔ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵۔ بی گلبرگ ۲ لاہور
۲۔ مکتبہ دین ودانش۔ چوک اُردو بازار۔ لاہور